نئی دنیا

بخت

نئی دنیا

بخت

naī duniyā

New World

by Bakht

(Urdu—Persian script)

© 2020 Chashma Media

پُراسرار کنواں

"بیٹا۔"

مَیں اُٹھ بیٹھا۔

"اوئے بیٹا! کنویں سے پانی بھر کر لا۔"

مَیں نے اپنی آنکھوں کو مَلا۔ اب تک مَیں خوابوں کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ سر میں سخت درد کی لہریں اُچھل رہی تھیں۔ کون مجھے بُلا رہا تھا؟ پردے بند تھے، اور کمرا اندھیرا تھا۔ لیکن بیٹھک سے روشنی کی کرنیں ٹٹول ٹٹول کر بستر کو چھو رہی تھیں۔ مَیں نے اُٹھ کر بیٹھک میں جھانکا۔ کوئی مہمان آیا تھا۔ باپ دبی دبی آواز میں بات کر رہے تھے۔

دو ایک ٹکڑے میرے کمرے میں بکھر گئے: "بے چارہ ... ملٹری ... فضول ... نہیں نہیں، کوئی فائدہ نہیں ... بہر حال ..."

لگ رہا تھا کہ ایک بار پھر میرا ذکر ہو رہا ہے۔ مَیں جھنجھلا کر آگے نکلا جہاں صحن تھا۔

"منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟" فریدہ کی آواز کونے سے آئی جہاں وہ برتن مانجھ رہی تھی۔

مَیں نے جواب میں کچھ نہ کہا، البتہ بہن مجھے بہت پیارتھی۔ گھڑا اُٹھا کر مَیں باہر نکلا۔ گلی میرے سامنے ویران و سنسان پڑی تھی۔ جھلسانے والی دھوپ کے باعث سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے تھے۔ واحد ایک ہڈیلا گدھا دیوار کے ساتھ چمٹا اُونگھ رہا تھا۔ مَیں لنگڑاتا ہوا کنویں کی سمت چل دیا۔ سائے دار دیواروں کے ساتھ ساتھ کھسکتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے مَیں کنویں پر پہنچ گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ "ایسی ظالم دھوپ میں کون جرأت کرے گا،" مَیں نے زیرِلب کہا۔ گھڑے کو کنارے پر رکھ کر مَیں ساتھ والے برگد کے سائے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"کاؤں کاؤں۔" مَیں نے اوپر دیکھا۔ ایک کالا کوّا اپنا سر ایک طرف جھکا کر تجسس سے مجھے تک رہا تھا۔

"تُو کیا کہہ رہا ہے؟" مَیں بولا۔ پھر اپنے آپ کو جھڑکی دی۔ "مَیں کیا کہہ رہا ہوں؟ بےزبان جانوروں سے باتیں کرنے لگا ہوں—آہ ..." میرے سر میں سے دوبارہ بجلی ایسے شدید درد کی لہر لپکی۔ کنپٹی پر ہاتھ لگا کر میری نگاہ اپنی نیم فالج ٹانگ پر پڑ گئی، اور دل کی تلخی ہونٹوں سے چھلک اُٹھی۔ خوب کہتے ہیں کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب لوگ میری بڑی عزت کرتے تھے۔ افسر بن کر ابّو جی کتنے خوش ہو گئے۔ کتنے فخر سے میرا ذکر کرتے۔ جب بھی مَیں گاؤں آتا تو سارے لوگ مشورہ لینے اور درخواستیں پیش کرنے آتے۔

"سرکار، آپ کیا مشورہ دیں گے؟ ... کیا خیال ہے؟ ... آپ بہتر جانتے ہوں گے ... افسر صاحب، اگر کوئی نوکری ملی تو ..."

پھر اچانک سب کچھ بدل گیا تھا۔ چند مہینے پلنگ پر ادھ موئی حالت میں لیٹے ہوئے بیت گئے تھے۔ صحت ہولے ہولے بحال ہوئی، لیکن دایاں پاؤں آج تک ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔

”اب عزت کہاں رہ گئی ؟ پڑوسی سلام تک نہیں کرتے، ہاں بچّے بھی میرے پیچھے ہنستے اور پتھر پھینکتے ہیں۔“

مَیں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر پھیر دیا۔ لیکن لعنت—چہرے کے دانے بھی بیماری کی یاد دلا کر میرا مذاق اُڑا رہے تھے، ”تُو بھدا ہے۔ تُو قبیح ہے۔ تیری کیا قدر ؟“

”اب میرا فائدہ صرف پانی بھرنے میں رہ گیا ہے،“ مَیں نے مایوسی سے سوچا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر مَیں اُٹھا۔ گھڑا پکڑ لیا اور کنویں میں جھانک ماری۔ پانی زمین کی گود میں جھلملا رہا تھا جیسا کہ خوش آمدید کہہ رہا ہو، ”آؤ نا، آؤ۔“ مَیں نے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھا کر کنویں میں گرنے دیا۔ تھوڑی دیر خاموشی، پھر ”غڑپ“ کی آواز۔ اچانک مَیں چونک پڑا۔ کنویں کے اندر سے ایک آواز نکلنے لگی۔ کوئی گنگنا رہی تھی۔ مگر اُس کی گنگناہٹ اِتنی مدھر، اِتنی میٹھی اور رسیلی۔

مَیں نے ایک اَور نظر کنویں میں ڈالی۔ عجیب بات یہ تھی کہ جوں ہی آواز بڑھتی گئی روشنی کنویں میں پھیلنے لگی۔ پھیلتے پھیلتے دیواریں رنگا رنگ جواہر کی طرح چمکنے لگیں۔ مَیں نے یہ ناقابلِ یقین منظر اچھی طرح دیکھنے

کے لئے اپنے سر کو کنویں کے منہ میں جھکایا۔ سریلی موسیقی اور ناچتی ہوئی روشنی کے جادو میں آ کر مَیں مزید آگے بڑھا، مزید آگے بڑھا۔

"ٹھاہ!" اچانک مَیں پھسل گیا اور چیختے چلاتے کنویں کی گہرائیوں میں گر گیا۔

خاموشی۔ منہ اندھیرا۔

ایک نئی دنیا

"غر غر غر۔" ہولے ہولے میری بے ہوشی دُور ہوتی گئی۔ "غر غر" کی آواز کان کے عین نزدیک سنائی دے رہی تھی۔ کیا قریب پانی بہہ رہا تھا؟ مَیں نے اپنی آنکھیں نیم وا کھول دیں۔ چاروں طرف شاداب سائے دار پیڑ آہیں بھر بھر کر کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ہَوا کے ہلکے سے جھونکوں سے اُن کے ہرے بھرے پتے سرسرا رہے تھے۔ میٹھی سریلی آوازیں گھنی شاخوں میں سے نکل رہی تھیں۔ مَیں نے سر کو اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ دو چار چھوٹی چھوٹی رنگا رنگ پنچھیاں ٹہنیوں پر پھدکتے ہوئے سورج کے غرق ہونے پر ماتم کا گیت گا رہی تھیں۔

جسم کی کاہلی اور ماحول کی خوب صورتی کی زد میں آ کر مَیں کافی دیر تک یوں ہی میٹھی گھاس پر لیٹا رہا۔ اچانک ایک سوچ بجلی کی طرح ذہن میں چمک اُٹھی۔ کنویں کا ماجرا یاد آیا۔ ”کیا مَیں فردوس میں تو نہیں؟“ مَیں زیرِلب بڑبڑایا۔ سر کو جھٹکا کر اُٹھ بیٹھا۔ مَیں کسی جنگل کی کھلی جگہ میں لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹی پیاری سی ندی سورج کی آخری کرنوں کے ساتھ ناچتی ہوئی اپنے آتشیں گھنگھرو ہلکی ہلکی بجا رہی تھی۔

مَیں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر پھیر دیا۔ یہ کیا جادو تھا؟ چہرے کے بھدے دانے کہاں چلے گئے تھے؟ ندی میں جھانکا تو سچ مچ چہرے کی جلد ننھے بچے کی جلد جیسی نرم اور ملائم تھی۔ نیچے دیکھا تو بے کار ٹانگ بھی ٹھیک ٹھاک کام کر رہی تھی۔ مَیں پھولا نہ سمایا۔ خوشی سے اُچھل کر چھوٹے بچّے کی طرح چلنے کودنے لگا۔

دن ڈھلنے لگا۔ شام کا دھندلکا جنگل میں پھیلتا گیا۔ نغمہ سنجی دھیرے دھیرے بند ہوگئی۔ اُس کے بدلے رات کی ڈراؤنی آوازیں اُبھر آئیں۔ فضا جھینگروں کی ’چوں چوں‘ اور مینڈکوں کی ’ٹر ٹر‘ کے زور شور سے بھر

گئی۔ لیکن ساتھ ساتھ کبھی شیر کی دہاڑیں اور کبھی ہاتھی کی چنگھاڑیں بھی میرے کان تک پہنچیں۔ میری خوشی خوف میں بدلنے لگی۔

"ہا ہا ہا۔"

مَیں چونک پڑا۔ دل دھڑکنے لگا۔ لکڑبگھے کی عجیب سی ہنسی قریب سے گزر گئی۔ اب پناہ کی جگہ کہاں مل جائے؟ چاند ایک بادل کے پیچھے چھپ گیا، اور مَیں اُس کی حوصلہ دینے والی مسکراہٹ سے بھی محروم ہوا۔ ندی جگمگاتے ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ کبھی اُنہیں پکارتی پھر اوجھل ہو جاتی، کبھی آگے جھلملاتی دکھائی دیتی۔ کبھی ایسا لگتا جیسا میرے ساتھ بھی کھیلنا چاہتی۔ اِس پُرکشش منظر کے جادو میں آ کر مَیں نہ جانے کیوں اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ندی آگے مڑتی ناچتی میری راہنمائی کرتی، اور مَیں راستہ ٹٹول ٹٹول کر اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، پر میرے ساتھ چلتی ڈگمگاتی ندی میرا سہارا کرتی۔ کچھ گھنٹے یوں چلتے چلتے اچانک دُور دُور چراغوں کی ٹمٹماتی روشنی دکھائی دی۔ میرے تھکے ماندے پاؤں کو نئی طاقت ملی، اور مَیں پوری کوشش سے آگے بڑھا۔ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ ایک عالی شان

محل سامنے پڑا ہے۔ رعب دار پہرے دار نیزوں سے لیس پھاٹک پر کھڑے ہیں۔ اندر محفل کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ یہ فریب دہ منظر دیکھتے دیکھتے اور اندر کی من موہن ہنسی خوشی سنتے سنتے محفل میں شریک ہونے کی شدید آرزو میرے دل میں اُبھر آئی۔ مگر کیسے؟ کیا پہرے دار مجھے دشمن نہیں سمجھیں گے؟

ندی کو چھوڑ کر مَیں محل کی موٹی فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر میرا حوصلہ کچھ بڑھ گیا۔ وہاں ایک موٹی لمبی سی بیل دیوار سے چمٹے اوپر والی منزل کی ایک کھڑکی تک پھیل گئی تھی۔ مَیں نے فوج میں چڑھنے کا فن خوب سیکھ لیا تھا۔ اب اِس تجربے سے فائدہ اُٹھا کر مَیں چڑھنے لگا۔ بیل اِتنی مضبوط تھی کہ ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ چڑھتے چڑھتے مَیں کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اندر جھانکا تو ایک شاندار ہال دیکھا۔ دوسری دیوار سے لگی ایک آتش دان میں دہکتی آگ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ دیواریں سندر رنگا رنگ تصویروں سے سجی ہوئی تھیں۔ میری توجہ خاص کر ایک طرف کھینچی گئی۔ کمرے کے درمیان ایک لمبا سا دسترخوان بچھا ہوا

تھا جس پر کھانے پینے کی عمدہ عمدہ چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ اُن کی خوشبو سونگھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔

"کیا مَیں اندر جاؤں؟" کچھ دیر تک مَیں جھجکتا رہا۔ لیکن پھر تجسس اور کھانوں کی خوشبو مجھ پر غالب آئی، اور مَیں اندر گھس گیا۔ افسوس، جوں ہی میرے پاؤں فرش سے لگے تو لوگوں کی چہکتی آوازیں قریب آنے لگیں۔ مَیں جھپٹ کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

دروازہ کھل گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ شاہی موسیقار دھوم دھام کے ساتھ اندر آئے، اُن کے پیچھے پیچھے چالیس مہمان۔ اُن کی رنگین وردیوں سے صاف معلوم ہوا کہ وہ رئیس اور حکمران ہیں۔ چراغوں کی روشنی میں اُن کے جواہر جگمگا رہے تھے۔ سب بڑے مسرور اور مطمئن لگتے تھے۔ کمرہ ڈھولکی، شہنائی اور مہمانوں کی ہنسی مذاق سے بھر گیا۔ مَیں سانس روک کر چوہے جیسا پردے کی پناہ میں دبکا رہا۔ مہمان کھانا کھانے لگے۔ پلیٹوں اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے رونق مزید بڑھ گئی۔ لیکن اب تک میزبان کی جگہ خالی تھی۔

اچانک ڈھولکی کی آواز سنائی دی۔ دروازہ دوبارہ کھل گیا اور ایک عظیم ہستی اندر آئی۔ خاموشی پھیل گئی۔ نہ جانے کیوں، اُس ہستی میں کوئی چیز تھی جس سے مَیں فوراً ڈر گیا۔ شاید اُس کا رعب یا اُس کا اختیار جو کچھ کہے بغیر محسوس ہوا۔ کیا معلوم۔

"اب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں گے،" مَیں نے سوچا۔

لیکن وہ رک گئے۔ چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"کیا کوئی بات ہے، شہزادہ سلامت؟" کسی نے احترام سے پوچھا۔

"کوئی اندر گھس آیا ہے جسے دعوت نہیں ملی،" شہزادے نے فرمایا۔

"لیکن ہم سبھوں کو دعوت دی گئی ہے،" کسی نے اعتراض کیا۔

شہزادہ خاموش رہے۔ میرا منہ خشک ہو گیا۔ اگر مَیں چیونٹی ہوتا تو ضرور دیوار کی کسی دراڑ میں گھس جاتا۔ شہزادے کے قدم کی آہٹیں آتے آتے پردے کے سامنے رک گئیں۔

"بیٹا، تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟" اُنہوں نے نرمی سے کہا اور پردہ پیچھے ہٹا دیا۔

مَیں اُس ہستی کو کس طرح بیان کروں؟ اُن کا چہرہ—ہاں، وہ کیسا تھا؟ اب بھی یہ بتانے میں مجھے دقت ہو رہی ہے۔ اگر مَیں بیان کرنے کی کوشش بھی کروں آپ نہیں سمجھیں گے۔ میرے دوست سب میری باتیں سن کر سر ہلاتے اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور مَیں دیکھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتے میری بات۔ کیونکہ گہری محبت کی جو لہر مجھے اُس لمحے محسوس ہوئی وہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میرے دوست ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسی محبت تھی؟ ہاں، کیسی محبت؟ ایسی محبت مَیں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اُس میں ماں باپ کی محبت، بھائی بہنوں کی محبت کی جھلک تو تھی۔ لیکن جس طرح کسی تصویر اور اُس کے اصل میں فرق ہوتا ہے، جس طرح بھڑکتی آگ اور موم بتی کی ٹمٹماتی لَو میں فرق ہوتا ہے اُسی طرح اُس کی اور ہماری محبت میں فرق ہے۔ اِس محبت کے نور نے میرے پورے جسم میں سرایت کی۔ کہہ لیں مَیں سرتاپا اُس محبت میں ڈوب گیا۔ جس طرح لوہا آگ میں سرخ ہو کر تمتمانے لگتا ہے یوں ہی میری پوری پوری حیثیت اُس محبت سے تمتمانے لگی۔ مَیں نے سوچا، ”سچ مچ یہی ہے زندگی۔ اب سے مَیں اُس میں ڈوبا رہوں گا۔“

لیکن ساتھ ساتھ ایک اَور چیز محسوس ہوئی جس سے اگر سچ کہوں مجھ پرسخت گھبراہٹ اور پریشانی طاری ہوئی، یوں کہ مَیں چیخ کر درد کے مارے کراہنے لگا۔ یہ بھی ایک ایسی بات ہے جو صرف وہ سمجھ سکتا ہے جسے خود اِس کا تجربہ ہوا ہو۔ اُس کامل اور بھڑکتی محبت کی روشنی میں میرے اندر کی خراب، ناپاک، گندی اور حرام چیزیں اُبھر آئیں۔ جو باتیں مَیں نے اپنے اندر دبائے رکھی تھیں بلکہ بڑی مہارت اور صبر سے چھپا کر بھولنے کی کوشش کی تھی وہ اب کڑک سے دل کی تہوں میں سے پھوٹ نکلیں۔ ساتھ ساتھ میرے اندر ایک آواز گونجنے لگی جو بڑھتی بڑھتی طوفان بن گئی، "تُو نالائق ہے، تُو نالائق ہے، تُو نالائق ہے۔"

میرے گھٹنے کانپنے لگے۔ ننگے پن اور گندگی کا ایسا احساس ہوا جیسا مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ "کیسی بات،" مَیں نے سوچا۔ "بے شک میرا بدن اب اِتنا بدصورت نہیں، تاہم مَیں اندر ہی اندر بھدّا اور گندا ہوں۔" بلکہ مَیں حیران ہوا کہ اب تک مجھے اِس کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ میری زندگی فلم کی طرح میرے سامنے سے گزری—بچپن میں سب سے پہلا جھوٹ، سب سے پہلی چوری ...

ماں کی آواز: "منظور، تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"
"امی، کچھ بھی نہیں۔"
"بیٹا، اپنا ہاتھ کھول۔ لَے۔ اگر کچھ نہیں ہے تو یہ بسکٹ کدھر سے آیا؟" ...

پھر جوانی کا گھمنڈ اور ضد ...

"منظور، اِدھر آ!"
"نہیں، کبھی بھی نہیں! تم لوگ سب غلط ہو!"
"ایسی گستاخی مت دکھانا اپنے ماں باپ کو۔"
"کیوں نہیں؟ جو چاہتا ہوں کروں گا۔" ...

زندگی کا ہر سخت لفظ، ہر جھگڑا۔ ہر قدم پر غصہ، لالچ، نفرت، زنا، جھوٹ۔ سخت مایوسی میرے اندر پھیل گئی۔ کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ سب سے مشکل بات یہ کہ یہ پاک ہستی سب کچھ جانتی ہے۔ اُس

کے نور میں کوئی بھی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مَیں کتنا گندا تھا، کتنا غلیظ۔ اور سچ مچ جب مَیں نے نیچے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہیں، اور اُن سے بے بیان تافُن آ رہا ہے۔

"مَیں ... مَیں ..." کوئی اَور بات میرے منہ سے نہ نکل پائی۔

"تُو اجازت لئے بغیر اندر گھس آیا ہے۔"

میرے پاؤں پگھل گئے۔ مجھے چکر آنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی طاری ہوگئی۔ گرتے ہی بجلی کی زوردار کڑک میرے کانوں میں گونج اُٹھی۔ پھر خاموشی۔

نہ جانے مَیں کتنی دیر سکتے کے اِس عالَم میں پڑا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے میرے شعور دوبارہ کام کرنے لگے۔ مَیں نے سنبھل کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ مَیں سخت زمین پر پڑا تھا۔ اپنے اعضا ٹٹول ٹٹول کر جلد ہی معلوم ہوا کہ جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

”غرغرغر۔“ مَیں نے سر اُٹھایا۔ وہی ندی قریب ہی بہہ رہی ہے۔ لیکن ستارے اوجھل ہو گئے ہیں۔ بادل گرج رہے اور بھاری بھاری بوندیں زمین پر گر رہی ہیں۔ ”آسمان رو رہا ہے،“ مَیں نے غم سے سوچا۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گالوں پر ٹپکنے لگے۔ میری گندی اور اجنبی حالت کا احساس دل پر غالب آ گیا، اور مَیں زار و قطار رو پڑا۔

سفر کا آغاز

’کاؤں کاؤں۔‘

مَیں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہی گھنا پیڑ نظر آیا جس کی پناہ میں سو گیا تھا۔ آسمان پر تڑکے کی گلابی انگلیاں ننھی ننھی بھیڑوں جیسی بدلیوں کو چھو کر اپنا رنگ اُن پر بکھیر رہی تھیں۔

’کاؤں کاؤں۔‘ میرے اوپر ایک کالا کوّا بیٹھا اپنی قوم کا ترانہ گا رہا تھا۔ جب میری نظر اُس پر پڑی تو اُس نے اپنی چونچ سے یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو، ”اُس طرف جاؤ۔“ پھر اُڑ کر اُسی سمت چند قدم آگے

کے درخت پر بیٹھ گیا اور دوبارہ مجھے تکنے لگا۔ لگتا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہو۔

مَیں اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل دیا۔ اب کیا حرج تھا۔ یوں ہم دونوں کوّا آگے اور مَیں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ایک آدھ گھنٹا گھومتے پھرتے ہم آخرکار موٹے تنے کے ایک پیڑ کے سامنے رک گئے۔ گو اُس کی چوٹی ٹوٹی ہوئی تھی لیکن اُس کا تنا کافی حد تک رہ گیا تھا۔ کوّا اُس پر بیٹھ گیا۔ اپنے سر کو ایک طرف جھکا کر وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک پھدک کر تنے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ مَیں بھی تنے کے پیچھے گیا تو کوّا کہیں نظر نہ آیا۔ لگتا تھا کہ وہ درخت سے نکلا گیا ہو۔ مَیں نے دو چار بار تنے کا چکر لگایا لیکن بے فائدہ۔ کوّا کہیں بھی نہیں۔ مَیں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ کیا جادو تھا؟ خیال کرتے کرتے میری نظر تنے کے اوپر والے حصے پر پڑ گئی۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ کسی دراڑ میں سے ہلکا سا دھواں سانپ کی طرح رینگتے ہوئے نکل رہا تھا۔ کمال تھا۔ مَیں اُٹھ کر دوبارہ دھیان سے تنے کے چھلکے کی جانچ لینے لگا۔ اُنگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر ایک چھوٹا سا سوراخ معلوم ہوا۔ اُس میں اُنگلی ڈالی

تو یکایک ایک چھوٹا سا دروازہ چپکے سے کھل گیا۔ مَیں تیزی سے اندر گھس گیا تو دروازہ میرے پیچھے بند ہو گیا۔

"الّو کا بچہ، کیوں نہیں بتایا تُو نے؟" میرے سامنے کوئی کسی کو جھڑکیاں دے رہا تھا۔

دھندلکے میں ایک چھوٹا سا کمرا نظر آیا۔ ایک چولھے پر کیتلی کا ابلتا ہوا پانی گنگنا رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک بونا بڑبڑاتے ہوئے چائے تیار کر رہا تھا۔ "اُس کو کس طرح راستہ پتا چلے گا؟"

"کاؤں۔ اُمید ہے کہ وہ خود بہ خود راستہ دریافت کرے گا،" ایک معذرت چاہنے والی آواز جواب میں سنائی دی۔ دوسری طرف کوّا موڑھے پر بیٹھا تھا۔ "تجھے معلوم ہے کہ یہاں دیواروں پر کان لگے ہوئے ہیں۔"

مَیں بڑے ادب کے ساتھ گلا صاف کر کے کچھ کہنے کو تھا کہ بونا مڑ گیا۔

"ارے! آ گیا ہے،" وہ خوشی سے چلایا۔ "شکر ہے۔ ہمیں فکر تھی کہ آپ کو اندر آنے کا راستہ نہیں ملے گا۔" آگ کی جگمگاتی روشنی

میں اُس کا چہرہ پُرسکون اور نیک لگتا تھا۔ اُس نے اپنی لمبی داڑھی کو تھپتھپایا۔ "کبھی کبھی میرا دوست زیادہ سوچتا ہی نہیں۔ بہر حال، آپ صحیح سلامت پہنچ گئے ہیں۔ میرا نام وسیم وفا ہے، اور یہ میرا دوست انور اُمید ہے۔" اُس نے کوّے کی طرف اشارہ کیا۔

مَیں نے کہا، "میرا نام منظور ہے۔ منظور متلاشی۔"

"جی، ہمیں معلوم ہے،" بونے نے کہا، "اب بیٹھئے۔" وہ ایک کونے میں سے موڑھا میرے لئے کھسکا لایا۔ "کیا چائے پئیں گے؟"

مَیں نے اپنا سر ہاں میں ہلایا۔ عجیب و غریب ساتھیوں کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ پہلے سے میرے نام سے واقف تھے؟

"یہ لیں،" وسیم مجھے پیالہ دے کر دوبارہ آگ کے قریب گیا۔ اب وہ آٹا گوندھ کر پراٹھے سینکنے لگا۔ جلد ہی کمرہ پراٹھوں کی لذیذ خوشبو سے بھر گیا۔ میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ بونا نہایت محنتی اور تیز لگتا تھا جبکہ کوّا زیادہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتے کرتے اپنے موڑھے پر یوں بیٹھا رہا جیسے کوئی میٹھا خواب دیکھ رہا ہو۔

مَیں چائے پیتا اور دونوں کو تکتا رہا۔ پھر کھانا تیار ہوا اور ہم تینوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔ مجھے پہلے کبھی کوئی کھانا اِتنا مزے دار نہیں لگا تھا۔ جب سب خوب سیر ہو گئے تو بونے نے تیزی سے برتن دھو کر دوبارہ چائے کے پیالے بھر دیئے۔ ہر ایک چسکی لے لے کر شعلوں کے سامنے اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔

"ہمیں بادشاہ سلامت سے بھیجا گیا ہے،" وسیم نے خاموشی کو توڑ کر کہا۔

"کون سا بادشاہ؟" میرا تجسس بڑھ گیا۔

"دنیا کا شاہنشاہ،" بونے نے جواب میں کہا۔

میرا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"اِس دنیا کا ایک ہی بادشاہ ہے،" کوّے نے وضاحت کی۔ "افسوس کہ اِس علاقے پر بادشاہ کے سخت دشمن کی حکومت ہے۔" دشمن کا ذکر کرتے ہی خدا جانے کیوں ایک لمحے کے لئے سرد لہر کمرے میں سے گزر گئی اور آگ کی روشنی مدھم پڑ گئی۔

بونا آہستہ بولا، "پہلے وہ تو بادشاہ کا کمانڈر تھا۔ بڑا اچھا اور طاقت ور تھا۔ کام کرنے والا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مغرور ہوا۔ سوچا کہ مَیں خود زیادہ بہتر طور سے حکومت کرسکوں گا۔ آخر میں اُسے محل اور فوج سے خارج کرنا پڑا۔ بڑی جنگ چھڑ گئی، تب اُسے ساتھیوں سمیت نکل کر بھاگنا پڑا۔ اب وہ یہاں ٹک گیا ہے۔"

"لیکن ڈرو مت،" انور نے تسلی دیتے ہوئے کہا، "بادشاہ سلامت نے ہمیں اِس مقصد کے لئے بھیج دیا ہے کہ آپ کی راہنمائی کریں۔"

مَیں نے اعتراض کیا، "لیکن مَیں کل شام سے ہی یہاں ہوں۔ وہ مجھ سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں؟"

بونے نے فخر سے کہا، "بادشاہ سلامت کے اپنے راستے اور طریقے ہیں۔ اُن میں اور ہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم کس طرح اُن کے مقاصد کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں؟" وہ مسکرایا۔ "بہر حال ہم آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔ اور حضور نے آپ کے لئے ایک تحفہ بھی بھجوا دیا ہے۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی چیز مجھے تھما دی۔ جب مَیں نے جھجکتے ہوئے اُسے کپڑے سے نکال لی تو میرا منہ حیرت

سے کھل گیا۔ میان میں ڈالی ایک دو دھاری تلوار نکلی۔ ایسی زبردست تلوار مَیں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جب اُنگلی پھل پر پھیری تو بونا چیخ اُٹھا، "احتیاط سے! یہ بَلا کی تیز ہے۔" اور سچ، گو مَیں نے بہت احتیاط برتی تو بھی خون کی کچھ بوندیں رسنے لگیں۔ دستے میں عمدہ قسم کے جواہر جڑے ہوئے تھے۔ اُس کے چمکنے دمکنے سے کمرہ روشن ہوا۔ مَیں نے اُسے آزمانے کے لئے پکڑ کر ہَوا میں لہرایا۔

"کاؤں، خبردار۔ مجھے مت مارو،" انور کوّا چیخا اور ایک طرف اُڑ کر ہٹ گیا۔

"او۔ ساری،" مَیں شرمایا۔

"آپ کو باہر مشق کرنے کے کافی موقعے ملیں گے۔ فی الحال اِسے میان میں ڈال کر کمر سے باندھ لینا،" بونے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تلوار کیوں؟ کہاں کام آئے گی؟" مَیں نے پوچھا۔

بونا اپنی داڑھی تھپتھپاتے ہوئے مسکرا دیا۔ "آپ کو جلد ہی پتا چلے گا۔ اب چلیں چلئے۔ ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔"

"جناب، ہم کہاں جا رہے ہیں؟" مَیں نے سوال کیا۔

بونا بولا، "فکر مت کرو۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مَیں نے آپ کو پہلے ہی بتایا کہ بادشاہ کے طریقے ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ وہ خود ہماری منزلِ مقصود ہیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو اُن تک پہنچانا ہے۔ لیکن چنتا مت کرنا۔ وہ قدم بہ قدم ہماری راہنمائی کریں گے۔" یہ کہتے ہی وہ مجھے نرمی سے دھکیل کر باہر لے گیا۔ ہمارا پراسرار سفر شروع ہوا۔

سرائے شکوک

کمرے کی مدھم سی روشنی سے باہر آتے ہی ہم پلکیں جھپکنے لگے۔ سورج کی کرنیں ہَوا میں لہلہاتے پودوں اور پیڑوں کے پتوں کے ساتھ کبڈی کھیل رہی تھیں۔ فضا چڑیوں کی بشاش چہچہاہٹ سے بھری ہوئی تھی۔

"کتنا دل کش منظر،" مَیں نے سوچا۔ "کیا یہ پرسکون جگہ سچ مچ دشمن کے قبضے میں ہے؟"

مَیں بولا، "دل کرتا ہے کہ کچھ دیر ٹھہر کر اِس سندر نظارے سے لطف اُٹھائے۔"

"ٹک!" ہم سب چونک پڑے۔ ایک تیر قریب کے پیڑ میں لگا ہوا اب تک ہل رہا تھا۔

یہ دیکھتے ہی وسیم میرے ہاتھ کو پکڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ کچھ فاصلے پر ہم ہانپتے ہوئے ایک گھنی جھاڑی میں گھس گئے۔ وسیم نے بھنچے ہوئے دانتوں میں سے سرگوشی کی، "دیکھا آپ نے اُس تیر کا رنگ۔"

"جی،" مَیں بولا۔ "وہ کالے رنگ کا ہے۔"

"یہ ہمارے دشمن کا سرکاری رنگ ہے۔ اب خاموش۔ وہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔"

اور سچ، تھوڑی دیر بعد سپاہیوں کا دستہ گھوڑوں کو دوڑاتے نظر آیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ایک دم دب گئی۔ ایک کالا بادل سورج کے سامنے چھا گیا۔ میرے دل پر بے بیان دہشت طاری ہوئی۔ سپاہی کالے کالے زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے چہرے نہایت سخت اور ظالم لگ رہے تھے۔ ہمارے قریب رک کر وہ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ کسی سپاہی کی نظر انور پر پڑی جو ایک پیڑ کی چوٹی پر اُڑ کر بیٹھا

تھا۔ ”شوں،“ اُس نے تیر چلایا۔ لیکن کوّا ایک طرف پھدک کر بچ گیا۔ محض ایک چھوٹا سا پر چکر کاٹ کاٹ کر آہستہ زمین پر آ ٹھہرا۔

”چل یار۔ چھوڑ دے اُسے۔ تفریح کرنے نہیں آئے،“ دستے کا لیڈر گرجا۔ پھر وہ ایڑ لگا کر آگے نکلے۔ عجیب بات یہ تھی کہ نہ فوجیوں نہ ہی گھوڑوں نے شور شرابہ مچایا۔ وہ خاموشی سے غائب ہوئے۔

”اُف!“ مَیں نے لمبی سانس کھینچ لی۔ ہم جھاڑی سے نکلے، اور کوّے نے اُتر کر دوبارہ ہمارا ساتھ دیا۔ اب میرا چلے جانے کا کوئی اعتراض نہ رہا۔ ہم دبے پاؤں کوّے کے پیچھے روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے ہم ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ اب دھوپ کافی تیز ہو گئی تھی۔ ایک پیڑ کی چھاں میں آرام کرنے کے بعد ہم چڑھنے لگے۔ مَیں ایک چوڑے راستے پر قدم رکھنے والا تھا کہ انور نے مجھے روک دیا۔ ”نہیں، اِس پر مت جاؤ۔“ اُسے چھوڑ کر وہ ہمیں ایک چھوٹی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر لے گیا۔ ”اِس راستے میں ہم کسی کو ملے بغیر چوٹی تک پہنچیں گے،“ اُس نے دبی آواز میں کہا۔

پگڈنڈی سانپ کی طرح کبھی اِس طرف، کبھی اُس طرف رینگتی ہوئی چڑھتی گئی۔ چڑھتے چڑھتے ہماری سانس پھولنے لگی۔ رنگا رنگ تتلیاں قسم قسم کے مہک دار پھولوں کی چسکی لے لے کر مستی سے جھوم رہی تھیں۔ نیلا نیلا آسمان ہمارے اوپر تبسم کر رہا تھا۔ مَیں اور وسیم پسینے سے شرابور ہو گئے، اور بھنبھناتی مکھیاں ہمیں تنگ کرنے لگیں۔ جب ہم ہانپتے ہانپتے چوٹی پر پہنچے تو دھوپ کی شدت ٹوٹ گئی تھی۔ جہاں راستہ دوسری طرف اُترنے لگا وہاں پھولوں سے بھرا ہوا باغ تھا۔ اُس کے بیچ میں ایک سرائے ہم کو آرام کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اِتنی محنت مشقت کے بعد یہ کتنا پُرکشش منظر تھا۔

”ہم رات کو سرائے میں بِتائیں گے،“ انور کوّے نے فیصلہ کیا۔ ہم باغ میں سے گزر کر دروازے پر پہنچے۔ ایک اَور مہمان ہم سے پہلے آ چکا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کچھ دہرا رہا تھا۔ مَیں نے دروازے کے اوپر نظر ڈالی تو وہاں دیوار میں کچھ کندہ کیا گیا تھا۔ مَیں نے آہستہ پڑھا، ”سرائے شکوک۔“ کان لگا کر سنا تو دوسرا نوجوان

بار بار بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا، "اندر جاؤں کہ نہ جاؤں ...نہ جاؤں کہ جاؤں؟"

سلام کرکے مَیں نے اپنے اور ساتھیوں کا تعارف کرایا پھر پوچھا، "آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"مَیں اِس کشمکش میں پھنسا ہوں کہ اندر جاؤں یا نہ،" اُس نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

"کیوں نہیں؟"

"ہاں، کیوں نہیں؟" وہ خوشی سے پکارا۔ "آپ کی بات بھی صحیح ہے۔"

مَیں نے دستک دی تو دروازہ کھلا۔ ایک خوش مزاج آدمی دہلیز پر کھڑا ہوا۔ "خوش آمدید، خوش آمدید،" وہ بولا اور ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ "جنگل کی طرف سے آئے ہوئے ہوں گے نا؟"

ہم سب نے ہاں میں سر ہلایا۔ اُس نے ہمیں گول کمرے میں لے کر چارپائیوں پر بٹھایا۔ ہم شکرگزاری کی سانس لے کر بیٹھ گئے۔

"کچھ کھائیں گے؟" بھٹیارے نے پوچھا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کچن میں غائب ہوا۔ کمرہ سادہ سا لیکن صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ کچھ دیر تک صرف آگ کی چٹختی آواز سنائی دی۔

"آپ کا اسمِ شریف؟" مَیں نے خاموشی توڑ کر دوسرے مہمان سے پوچھا جو جھکتے ہوئے ہمارے ساتھ داخل ہو گیا تھا۔

"طارق،" وہ بولا۔ "طارق تذبذب۔"

"ہیلوا" ایک لمبے قد کے نوجوان نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر آواز دی۔ "کوئی ہے؟" ہمیں دیکھ کر وہ ایک لمبی دبلی ٹانگ اندر ڈال کر کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن پہلی ٹانگ دوسری کے ساتھ اُلجھ گئی، اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ زمین پر بیٹھے اُس کی بڑی اور نیلی نیلی آنکھوں نے سنجیدگی سے ہمیں دیکھا پھر کہا، "سلام! میرا نام بیربل ہے۔"

"بیربل؟ مَیں تو صرف اکبر بادشاہ کے وزیر بیربل کو جانتا ہوں،" مَیں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، وہی۔" وہ بولا۔ "میرے چچا رامن کو اکبر اور بیربل کی کہانیاں بڑی پسند تھیں۔ وہ بولے، 'بیربل نام رکھو گے تو کیا جانے یہ بیٹا کہاں سے کہاں تک پہنچے گا'۔"

ہم دوسروں نے اپنا اپنا تعارف کرایا، اور وہ ہمارے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ کیسا عجیب بندہ تھا۔ اُس کی گنجی کھوپڑی چمک رہی تھی جبکہ چونچ جیسی ناک کے نیچے پتلے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک کان سے دوسرے تک مسکان رہتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ گپیں مارنے سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔

"لگتا ہے کہ آگے کا سفر کچھ مشکل ہو گا،" طارق بولا۔

"آپ کی بات بالکل درست ہے،" بھٹیارے نے واپس آ کر گرما گرم نان اور لذیذ سالن ہمارے سامنے میز پر رکھ کر کہا۔ "آپ خود دیکھ لیں۔" اُس نے ایک کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دکھایا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ چھوٹی چھوٹی بدلیاں اُسے الوداع کہنے کے لئے افق پر جمع ہو گئی تھیں۔ اُس طرف وہی جنگل پھیلا ہوا تھا جس سے ہم نکلے تھے۔ سورج کی آتشیں کرنوں میں وہ نہایت جادو فریب لگ رہا تھا۔ پھر اُس نے دوسری طرف کی کھڑکی کھولی۔ اُس کا نظارہ دیکھ کر ہم سخت گھبرا گئے۔

افق تک ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ نہ کوئی درخت نہ کوئی پودا۔ اُس طرف نئے چاند کا جام ابھر آیا تھا۔ اُس کی روپہلی چاندنی میں سلیٹی ٹیلوں کے بھوت جیسے لمبے لمبے سائے پہرا لگا رہے تھے۔ ہماری پریشانی دیکھ کر بھٹیارا مسکرایا۔

"ظاہر ہے کہ عقل مند انسان کون سا راستہ اختیار کرے گا،" اُس نے فتح مندی سے کہا۔

"بالکل،" بیربل چہچہایا۔ "ریگستان ہی جانا ہے۔"

بھٹیارا پھر گیا۔ "آپ کے ساتھی کچھ بھولے بھالے لگتے ہیں۔ اُن کو سمجھانا، نا۔ کہ یہ بہت مشکل سفر ہے۔"

بیربل نے اُس کی سنی اَن سنی کر کے کہا، "مجھے ریگستان بہت پسند ہے۔ کتنے سندر ٹیلے۔ اُن پر چڑھ کر کتنا مزہ آئے گا۔ میرے چچا رامن نے ایک بار کہا، 'بیربل بیٹا۔ ریگستان نصفِ جہان۔ اُس سے نپٹو تو ہر مسئلے سے نپٹو گے۔' یہ اُنہوں نے اُس وقت کہا جب ریگستان میں مارے مارے پھر کر ادھ موئی حالت میں گاؤں واپس پہنچے تھے۔"

طارق شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُس نے پوچھا، "کیا ریگستان میں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا ؟"

"آپ خود جھانک ماریں۔ کیا کوئی راستہ نظر آتا ہے؟ نہیں۔ اگر آپ میرا مشورہ قبول فرمائیں تو آپ سیدھا واپس چلیں گے۔"

مَیں نے مایوسی سے اپنے دو ساتھیوں پر نظر ڈالی تو انور اُڑ کر میرے کندھے پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے میرے کان میں بولا، "فکر مت کرنا۔ اِس آدمی سے خبردار رہنا۔ بادشاہ نے پہلے سے مجھے آگاہ کیا ہے۔ اِس کی نہ ماننا۔"

یہ سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ لیکن طارق کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔

"20 دن ہوئے سپاہیوں کے ایک دستے نے میرا مشورہ رد کیا،" بھٹیارا بولا۔ "پرسوں ایک بندہ واپس آیا۔ یقین کرو، جناب! دوسرے لوگ سب کے سب جھلساتی دھوپ میں بھٹکتے بھٹکتے مر چکے تھے۔ واحد ایک ہی بچ نکلا۔" جب اُس نے محسوس کیا کہ مَیں اُس کی بات سے متاثر نہیں ہو رہا تو وہ میری طرف دھیان دے کر کہنے لگا، "میری

مان لو۔ ذرا سوچو۔ مجھے دھوکا دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے لئے جھوٹ بولنے میں کیا فائدہ ہوتا ؟"

"سو کیا یہ آپ ہی کے سپاہی ہیں جو کالے زرہ بکتر پہنے باہر گھومتے پھرتے ہیں ؟" بیربل نے معصومیت سے پوچھا۔

"کون سے سپاہی ؟ مَیں نے تو نہیں دیکھا،" بھٹیارے نے جھنجھلا کر پوچھا۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن آنکھوں میں غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

بیربل بولا، "مَیں چوڑے راستے پر چڑھ رہا تھا کہ کالے زرہ بکتر پہنے دو سپاہیوں نے مجھے روک دیا۔ کہا کہ آگے مت جاؤ، راستہ بند ہے۔ لیکن مَیں اِتنا بڑا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ مَیں نے نیچے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے چیخا، 'وہ دیکھو!' اُن کو جھٹکا لگا اور اُس طرف دیکھنے لگے تو مَیں سیدھے آگے بھاگ نکلا۔ لیکن افسوس، اُنہوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

"پھر کیا ہوا ؟" مَیں نے پوچھا۔

"وہ مجھے پیٹنے لگے۔ ہائے ہائے، میری ہڈی ہڈی دُکھ رہی تھی۔ شکر ہے کہ مَیں جنگلی کتوں کی وجہ سے بچ گیا۔"

"جنگلی کتوں کی وجہ سے؟" بھٹیارے نے تعجب سے پوچھا۔

"جی، بالکل۔ اچانک کتوں کے دَل نے ہم پر وار کیا۔ بڑا شور شرابہ مچ گیا۔ جب وہ غراتے اور بھونکتے ہوئے ہم سے اُلجھ گئے تو مجھے اپنے چچا رامن کا خیال آیا۔"

"چچا رامن؟"

"ہاں۔ ایک بار وہ جنگل میں کیلے اُٹھائے چل رہے تھے کہ بندر اُنہیں تنگ کرنے لگے۔ تب وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے کچھ کیلے پھینک کر بھاگنے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ پھینکتے گئے اور بندر کھاتے گئے۔ جب اگلے گاؤں پہنچے تو کیلے تمام ہوئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے، 'بیربل بیٹا، یہ پوچھا کرو کہ کیا کیلے زیادہ اہم ہیں یا میری جان'۔" یہ یاد کرکے مَیں سفر کی روٹی سپاہیوں کو

تھا کر بھاگ گیا۔ تب کتے مجھے چھوڑ کر سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اُتنے میں مَیں سکون سے سفر جاری رکھ سکا۔"

"کیسی بات!" وسیم بولا۔ "آپ کہاں جا رہے ہو؟"

بیربل جھجکا۔ "پتا نہیں کہ آپ میری بات مانیں گے۔"

"بتاؤ تو سہی۔" انور ٹرایا۔

"مَیں بادشاہت کی تلاش میں ہوں۔ کیا آپ نے اِس کے بارے میں کچھ سن لیا ہے؟ اب میرے دوست مجھے بیربل بے وقوف کہتے ہیں۔ ایک نے بھی میری بات نہ مانی۔"

"واہ جی واہ!" وسیم نے داد دی۔ "بہت خوب۔ آپ ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ہم بھی اُس طرف جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر بیربل پھولے نہ سمایا۔

بھٹیارے نے جواب نہ دیا۔ معلوم نہیں کیوں، وہ نہایت ناخوش لگ رہا تھا۔ ہم مل کر کھانا کھانے لگے۔

طارق بولا، "لیکن ہمیں کوشش تو کرنی چاہیئے کہ نہیں؟ شاید کچھ دیر کریں؟ یا شاید مزید معلومات حاصل کرنا چاہیئے۔"

بھٹیارا بولا، "ضرور دیر کرنا چاہئے۔ تب آپ کو معلوم ہو گا کہ آگے جانا فضول ہے۔"

بیربل چہکا، "ہاں، ہاں۔ مَیں تو کل صبح سویرے ہی چلا جاؤں گا۔ کتنا مزہ لیں گے ہم!"

بھٹیارا اپنے عجیب مہمان کوئی جواب نہ دے پایا، اور وہ خاموش رہا۔

ہم سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، پھر انگڑائیاں لیتے ہوئے اجازت مانگی۔ گول کمرہ خواب گاہ میں بدل گیا۔ بھٹیارے نے آگ بجھا دی اور پلیٹیں لے کر چلا گیا۔ چارپائی پر اپنے پاؤں پھیلاتے ہی مَیں گہری نیند سو گیا۔ لیکن سوتے سوتے عجیب و غریب خواب میرے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے پریشان کرنے لگے۔

ایک خواب میں ماں باپ غصے سے چیختے چلاتے مجھے بُلا رہے ہیں۔ لیکن پوری جد و جہد کے باوجود مَیں اُن کے پاس نہیں آ سکتا۔ وہ دھمکیاں دینے لگتے مگر بے فائدہ۔ پھر ابو جی میرے بالوں کو پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کرتے۔ لیکن میرے پاؤں جم گئے ہیں۔ آخر میں وہ مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ ماں کے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر میرا

دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اب میری پیاری بہن نمودار ہو کر التجا بھری نظروں سے مجھے اپنے ساتھ جانے کو کہتی ہے۔ سسکیاں بھر بھر کر وہ میرے ہاتھ کو پکڑ لیتی ہے۔ میرا دل اُسے راضی کرنے کو کرتا ہے، اور سچ مچ مَیں کھسکتے کھسکتے اُس کے پیچھے ہو لیتا ہوں۔ لیکن اچانک ایک چمکتی ہوئی ہستی راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ اُسے دیکھ کر میرا جانے کا ارادہ جاتا رہتا، اور مَیں دھڑام سے بہن سے الگ ہو جاتا ہوں۔ وہ چیختی چلاتی غائب ہو جاتی ہے۔

مَیں جاگ اُٹھا۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ پھر کروٹ بدل کر ایک زیادہ ڈراؤنا خواب دیکھنے لگا۔

مَیں ایک جنگل میں ہوں۔ راستہ کوئی نہیں دِکھتا۔ تب ایک سانپ قریب کے درخت پر رینگنے لگتا ہے۔ میری دہشت زدہ آنکھوں کے سامنے ہی ایک سندر رنگا رنگ پنچھی اُس کی لپیٹ میں آجاتی ہے، اور وہ اُسے گھونٹتے گھونٹتے ختم کر دیتا ہے۔ آخر پنچھی کا بے جان جسم گیلی گھاس پر گر کر پڑا رہتا ہے۔

اب سانپ شاخ سے لٹک کر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ”سی سی، تُو کون ہے؟“ وہ سِسکارتا ہے۔ ”مَیں بتاتا ہوں تجھے۔ تُو کچھ بھی نہیں ہے۔ اِتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارنا فضول ہے۔ چھوڑ دے اپنی کوششیں۔ زندگی کے مزے لے اور بس۔ یہ کیا وہم تیرے سر پر سوار ہوا ہے؟ بادشاہت؟ شہزادہ؟ اگر ہو بھی تو تُو کہاں اور وہ کہاں؟ سی سی سی... تُو خاک ہے اور دوبارہ خاک میں مل جائے گا۔ بات ختم۔ فضول ہیں تیری کاوشیں، فضول، فضول!“

سانپ کی سسکارتی آواز گونجتی جاتی۔ یکایک وہ آگے لپکتا ہے، اور میرا سُنّ بدن اُس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ وہ بل کھاتے کھاتے مجھے گھونٹنے لگتا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے ایک اندھیرے گڑھے میں کھینچتا رہتا ہے، ایک ایسے گڑھے میں جس کی کوئی تہہ نہیں۔

”سچ ہے اُس کی بات،“ مَیں مایوسی سے سوچتا ہوں۔ ”مَیں کون ہوں؟ مَیں کہاں سے آیا ہوں؟ مَیں کہاں جا رہا ہوں؟“

اچانک ایک پرسکون آواز فرماتی ہے، ”مَیں ہی نے تجھے جان لیا ہے۔“ نیچے دیکھتا ہوں تو وہی پُرنور ہستی بانہوں کو پھیلا کر کھڑی ہے۔ ”وہ

مجھے پکڑ کر بچانے کے لئے کھڑے ہیں،" مَیں حیرت سے سوچتا ہوں۔ سانپ ایک دم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غائب ہو جاتا ہے، اور مَیں اُس ہستی کے نرم و ملائم بانہوں میں گر جاتا ہوں۔

اُس کو مَیں کس طرح بیان کروں؟ اب اُس کے نرم ہاتھ میرے ماتھے کو چھو دیتے ہیں، اور میرے بے حس و حرکت اعضا کو نئی طاقت ملتی ہے۔ میرا دل اطمینان اور سکون سے بھر جاتا ہے۔ مَیں اپنا سر اُٹھاتا ہوں۔ یہ ہستی میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی ہے۔ اچانک مَیں اُسے پہچان لیتا ہوں۔ محل کے مالک ہیں۔ اُن کے چہرے کو تکتے تکتے مَیں اُن کی مسکان میں غرق ہو جاتا ہوں۔

ریگستان

مَیں جاگ اُٹھا۔ اب تک اندھیرا تھا۔ بونا اور کوّا سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ طارق اب تک گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ مَیں نے اُسے ہلایا تو اُس نے صرف ”اوں“ کہہ کر کروٹیں بدلیں۔ زور سے جھنجھوڑا تو وہ بڑبڑایا، ”چھوڑ دو مجھے۔“

ہمارا عجیب ساتھی بیربل پشتی تھیلا باندھ کر تیار کھڑا تھا۔

”آؤ، چلیں،“ وسیم نے سرگوشی کی۔ اپنا تھوڑا سا سامان اُٹھا کر مَیں دروازہ کھولنے کو تھا کہ کوّے نے مجھے روک دیا۔ ”اِدھر سے،“ وہ بولا اور کھڑکی کو چونچ سے کھول کر باہر نکلا۔ ہم چپکے سے اُس کے پیچھے روانہ

ہو گئے۔ اب تک باغ میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ہم نے اوس سے تر گھاس میں سے گزر کر ریگستان کا رخ لیا۔ دو چار قدم آگے بڑھے تو اچانک مجھے سردی لگی۔ ایک طرف کوئی آدمی دبی آواز میں بول رہا تھا۔ وہاں جھانکا تو دھندلکے میں بھٹیارا چند کالے زرہ بکتر پہنے سپاہیوں کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ پھر 'جھنک جھنک' کی آواز۔ بھٹیارے نے اپنی جیب میں چمکتے ہوئے سکے ڈال دیئے۔ ہم جلدی جلدی دبے پاؤں آگے نکلے۔

اُترتے وقت سورج کی چٹیا اُفق پر دِکھنے لگی، پھر اُس کا لال پیلا سا منہ۔ ہمارے نیچے دُور دُور تک لق و دق بیابان بچھا ہوا تھا۔

"ٹھہرو! ٹھہرو!" یکایک کسی کی چیختی چلاتی آواز ہمارے کان میں پڑ گئی۔ مڑ کر دیکھا تو طارق ٹوٹ کر ہمارے پیچھے دوڑے آرہا ہے۔ "شکر ہے کہ آپ کو ملا،" وہ پہنچ کر پھوٹ پڑا۔ پہلے اِتنا پریشان تھا کہ کوئی صاف بات نہ نکل پائی۔ پھر ہانپتے ہوئے ہمیں اپنی رام کہانی سنائی۔ ہمارے بعد اُٹھا تو جلدی جلدی دروازے سے نکلنے کو تھا کہ بھٹیارا کالے زرہ بکتر پہنے سپاہیوں کے ساتھ اُس کی تاک میں بیٹھا تھا۔ اُسے پکڑ کر

پوچھا کہ دوسرے کہاں ہیں۔ جب وہ کوئی جواب نہ دے سکا تو خوب مار پیٹ کر دفع کر دیا۔ "لگتا تھا کہ وہ مجھ میں کوئی دل چسپی نہیں لے رہے تھے۔ زیادہ آپ ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں،" وہ بولا۔

ہم ریگستان کے کنارے تک پہنچے۔ ریت دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔

انور بولا، "ہمیں جتنی جلدی ہو سکے بیابان کو عبور کرنا ہے۔"

طارق نے غمگین ہو کر پوچھا، "کیا کوئی اور راستہ نہیں؟"

"نہیں، صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

"ارے، یہ کیا ہے؟" نزدیک ہی ریت کے ایک ٹیلے کے پیچھے کوئی چیز چمک رہی تھی۔ آگے بڑھے تو وہاں ایک چھوٹی سی جیپ کھڑی تھی۔ طارق اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا بلکہ جیپ پر جھپٹ پڑا۔ چابی لگی تھی۔ اُس نے اُس پر سوار ہو کر چابی گھمائی۔ موٹر کی گڑگڑ کی آواز نکلی۔ "ٹھیک ہی چل رہی ہے،" طارق خوشی سے للکارا۔

"آپ اِسے استعمال مت کرنا۔ جہاں ہم جائیں گے وہاں ریت اُتنی نرم ہے کہ جیپ اُس میں دھنس جائے گی۔" انور امید نے تنبیہ دی۔

”پھر مَیں سخت زمین ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُسی پر سے گزروں گا،“ طارق موٹر کی آواز کا مقابلہ کرتے ہوئے چلّایا۔ پھر بھی وہ کافی دیر تک جھجکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا رہا۔ لیکن آخرکار وہ دھوئیں کے بدبودار بادل میں چھپ کر روانہ ہوا۔ مَیں رشک کی نظر سے اُس کے پیچھے تکتا رہا۔ پھر انورکوّے نے مجھے اپنی چونچ سے کندھے پر تھپکی دے کر کہا، ”چلیں۔ آج لمبا راستہ طے کرنا ہے۔“

وسیم بیربل سے بولا، ”بھئی، تمہارا پشتی تھیلا بہت بھاری ہے۔ اُس میں کیا رکھا ہے تم نے؟“

بیربل چہکا، ”یہ سب بہت ضروری چیزیں ہیں۔ مَیں نے چھوٹا سا چولہا اور اُسے چلانے کے لئے مٹی کے تیل کا کنستر رکھا ہے۔“

وسیم بولا، ”دوست، بہتر ہے کہ اِسے یہیں چھوڑ دو۔ یہ بھاری ہے اور یہاں کام نہیں آئے گا۔“

لیکن بیربل اَڑا رہا، تو ہم ٹھنڈی سانس بھر کر ریگستان پار کرنے لگے۔ نرم نرم ریت کے ٹیلوں پر قدم رکھ کر پاؤں اکثر ایڑی تک بلکہ کبھی گھٹنے تک دھنس جاتا۔ گھاس کا تنکا تک اُس ویران علاقے میں نظر نہ آیا۔

چاروں طرف ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے اور اوپر جھلساتی دھوپ۔ کہیں پناہ لینے کی کوئی جگہ نہیں۔ کوّا کبھی میرے اور کبھی وسیم کے کندھے پر اُڑ کر بیٹھ جاتا۔ کبھی ہوا میں اُڑ کر راہ تلاش کرتا۔ ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مَیں نے اندازہ لگایا کہ آیا ہم راکھ بن جائیں گے یا موم کی طرح پگھل جائیں گے۔ لیکن اب مرنے کا امکان ہی نہ تھا۔

شروع میں بیربل بڑا مزہ لے لے کر چل رہا تھا۔ کبھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر نظارے کی تعریف کرتا، کبھی ریت کی خوب صورتی پر دھیان دیتا۔ لیکن ہولے ہولے اُس کا جوش مدھم سا پڑ گیا، اور آخرکار وہ بھی چپکے سے چلتا گیا۔ اُس کا پشتی تھیلا اُسے بہت تنگ کرنے لگا۔

چلتے چلتے دن ڈھلنے لگا۔ بونے کے پاس پانی کا جو کنستر تھا خالی ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک ٹیلے کے پیچھے گیا اور کرید کرید کر چھوٹا گڑھا بنایا۔ ”اِس جگہ سے بدو صدیوں سے پانی نکالتے ہیں،“ اُس نے وضاحت کی۔ پہلے کوئی پانی دکھائی نہ دیا۔ مگر دھیرے دھیرے گڑھے کی تہہ میں نمی جمع ہونے لگی۔ اور دیکھتے دیکھتے آدھا گڑھا بھر گیا۔ وہاں ہم رات کے لئے ٹھہر گئے۔ سورج ڈوب گیا اور چاند اُبھرنے لگا۔ یہاں لاتعداد

جگمگاتے ستاروں کے نیچے انسان اپنے آپ کو کتنا چھوٹا اور لاچار محسوس کرتا تھا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی۔ ہم نے کروٹیں بدلتے سرد زمین پر رات گزاری۔ سب خوش ہوئے جب تڑکے کی نرم ملائم اُنگلیاں ہمارے اکڑے اعضا کی مالش کرنے لگی۔ انگڑائیاں لیتے ہوئے ہم نے سفر جاری رکھا۔ کافی دیر تک کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی، اور ہم خاموشی سے پسینے میں شرابور آگے بڑھتے گئے۔

دوپہر کے وقت اُفق پر چند بڑے بڑے پرندے ہَوا میں سستی سے منڈلاتے ہوئے نظر آئے۔

"گدھ،" انور نے گھن سے کہا۔ "یہ غلیظ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ کیا کوئی جنگلی جانور مرنے والا ہے؟"

نزدیک آ کر تو کیا دیکھتے ہیں۔ ایک بے جان شکل ریت پر پڑی ہے۔

"طارق!" مَیں چیخا۔

بے چارے نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں نے لپک کر اُس کی نبض دیکھی۔ "بے ہوش ہے لیکن خدا کا شکر ہے زندہ ہے۔ اُسے پانی پلا دینا۔"

وسیم نے احتیاط سے اُس کے منہ میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈالا تو ہولے ہولے اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ "مَیں ... مَیں کہاں ہوں؟" اُس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"پہلے آرام کرو،" بونے نے اُسے تسلّی دے کر کہا۔

طارق نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ بونے نے اُسے رک رک کر اَور پانی پلایا۔ پھر طارق نے آہستہ کہا، "آپ کی بات درست نکلی۔ کل دوپہر کو جیپ دھنس گئی، ریت میں۔ پھر مَیں پیدل چلنے لگا ..."

"اب آرام کرو،" مَیں نے کہا۔

ہم نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ فیصلہ ہوا کہ شام کے وقت سفر کو جاری رکھیں گے۔ سب دھوپ میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ یکایک مَیں اُٹھ بیٹھا۔ سورج کی آخری ظالم کرنیں ریت کو خون میں بھگو رہی تھیں۔ مَیں نے چاروں طرف جھانک ماری۔ طارق اوجھل ہو گیا تھا۔ مَیں اُچھل

پڑا۔ بیربل بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنے پشتی تھیلے میں ٹٹولنے لگا۔ "میرا کنستر کہاں چلا گیا؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔ ہر طرف ڈھونڈا، لیکن مٹی کے تیل کا کنستر غائب ہو گیا تھا۔

"طارق نے یہ سوچ کر کہ اُس میں پانی ہے اُسے چھین لیا ہو گا،" مَیں بولا۔ "اب وہ کس طرح بچے گا؟"

دوسرے بھی بیدار ہو چکے تھے۔ جب پتا چلا کہ کیا ہوا ہے تو کوّے نے کہا، "بے شک وہ بھاگ گیا ہے۔ سوچا ہو گا کہ پانی کم ہے۔ بے چارہ بے وقوف۔ اب وہ کس طرح راستہ معلوم کر پائے گا؟ اور پانی بھی نہیں ہے۔"

ہم آگے بڑھے۔ رات کی سیاہ فام اور ملائم چادر ہمارے ارد گرد لپٹ گئی۔ چاندنی اور جگمگاتے ستاروں کی روشنی میں کافی دیر چلتے چلتے آخرکار چند کالی دیو جیسی شکلیں سامنے نظر آئیں۔

"شکر ہے! پہنچ گئے ہیں،" کوّے نے کہا۔

چھوٹا سا نخلستان تھا۔ کھجور کے کچھ پیڑ ایک گنگناتے چشمے کی خدمت میں حاضر تھے۔ میٹھے میٹھے کھجوروں اور چاندنی میں چمکتے پانی سے سیر ہو کر

ہم نے نرم و ملائم گھاس میں اپنے پاؤں پھیلائے۔ انور کوّا ایک چھوٹے سے درخت پر بیٹھ گیا۔ ہلکی ہلکی ہَوا نخلستان میں پھسپھسا رہی تھی، اور درخت جواب میں آہیں بھر رہے تھے۔

"گھاس کی کتنی عمدہ خوشبو ہوتی ہے،" مَیں بولا۔ بیربل کی طرف دیکھا تو وہ خراٹے مارنے لگا تھا۔

کوّا ٹرّایا، "یہاں بادشاہ کے فرزند ایک بارٹھہرے۔ 40 دن اکیلے رہے۔"

"کیوں؟" مَیں نے دل چسپی سے پوچھا۔

"وہ ریگستان کو پار کر کے دشمن کے علاقے میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے،" اُس نے جواب دیا۔ دو چار لمحوں کے لئے خاموش رہا۔ صرف چشمے کا گیت اور درختوں کی آہ و نالہ سنائی دی۔

"شاہزادے نے یہاں اپنا زرہ بکتر، ڈھال اور تلوار اُتار کر ایک نہایت سادہ سا چرواہے کا لباس پہن لیا۔ اُن کے منصوبے سمجھ سے باہر ہیں۔" وہ پھر خاموش ہوا۔

"پھر کیا ہوا؟" مَیں نے بے قراری سے سوال کیا۔

"دشمن اُن کی تاک میں بیٹھا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک زبردست سورمے کے انتظار میں تھے اِس لئے سپاہیوں نے اُن پر دھیان نہ دیا۔ یوں وہ چرواہے کے کپڑے پہنے ملک میں داخل ہوئے۔"

"کیا اُنہوں نے لوگوں کو بغاوت کے لئے اُبھارا؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ وہ ہر جگہ گھومتے پھرتے لوگوں کو اپنی بادشاہی کے بارے میں سنانے لگے۔ اُن کی سیدھی سادی باتیں سن کر لوگ اُس بادشاہت میں دل چسپی لینے لگے۔ شاہزادے میں کوئی جادو تھا جو سننے والے ہجوموں کو اپنی طرف کھینچ لاتا تھا۔"

"لیکن اِس کا کیا مقصد تھا؟" مَیں نے پوچھا۔ "کیا وہ اپنی عظیم فوج کے ساتھ ملک پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے؟"

وسیم نرمی سے مسکرا دیا۔ "آپ کو بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شاہزادہ ایسا بندہ نہیں ہیں۔ وہ ظالم نہیں ہیں۔ وہ لوگوں کا مال نہیں چاہتے بلکہ اُن کے دل، اُن کی محبت۔ بادشاہت کو بیان کرنے سے وہ اُمید رکھتے تھے کہ لوگوں کے دل جیت لیں گے۔ بہر حال

آخرکار دشمن کے جاسوس اُن پر توجہ دینے لگے۔ اپنے مالک کو اطلاع دی کہ یہ سادہ سا چرواہا رعایا کو بادشاہ کی طرف مائل کر رہا ہے ۔ پھر اِس شریر سردار نے کیا کیا ؟ کیا اُس نے شہزادے کو مار ڈالا ؟ نہیں، اُس کے طریقے بہت گھٹیا ہیں۔ اُس نے اپنے جاسوس کے ذریعے لوگوں کو چرواہے کے خلاف اُکسایا۔"

"لیکن وہ تو شاہزادے کے دوست تھے،" مَیں نے اعتراض کیا۔

"جی، ضرور۔ لیکن انسان کی فطرت کے بارے میں کیا بتاؤں،" کوّے نے جواب دیا۔ "جتنا وہ پہلے اُن کے حق میں تھے اُتنا ہی وہ اب اُن کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ وہ اِتنے طیش میں آئے کہ آخر میں اُنہوں نے اُنہیں پھانسی دی۔"

"تو سب بے کار اور فضول تھا!" مَیں نے مایوسی سے کہا۔

"یہ سب کچھ بادشاہ کا منصوبہ تھا،" بونا بولا۔

مَیں بڑبڑایا، "یہ تو کوئی اچھا انجام نہیں تھا۔"

کوّے اور بونے نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں بپھر گیا۔ حماقت کی ایسی باتیں کون برداشت کرسکتا ہے؟ مَیں خاموشی سے اُٹھا اور بے سوچے سمجھے کھجور کے پیڑوں میں سے گھومنے لگا۔

ایک عمدہ تلوار

خدا جانے مَیں کیوں اِس قدر ناراض ہو گیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بار بار اپنی خالص دوستی کا اظہار کیا تھا۔ شاید مجھے اُن کی اِن عجیب باتوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ مَیں اندھا دھند چلتے چلتے نخلستان کے کنارے تک پہنچا، پھر اُس کے کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ ابھی تک دل پریشانی اور غصے سے مضطرب تھا۔ یوں بے مقصد گھومتے پھرتے یکایک کچھ فاصلے پر آگ کی روشنی رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتی نظر آئی۔ مَیں نے نخلستان کو چھوڑ کر اُس طرف رخ کیا تو ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ آگ کے ارد گرد حول ناک شکلیں

ناچ رہی تھیں۔ دُور سے انسان لگتے تو تھے لیکن قریب آ کر پتا چلا کہ اُن کے سر مختلف وحشی جانوروں کے سے تھے۔ کسی کا سر بھیڑیئے کا تھا، دوسرے کا لکڑبگھے کا، تیسرے کا مرغ کا۔ غور سے دیکھا تو اُن کے ہاتھ اور پاؤں جانوروں کے تھے جبکہ اکثروں کے پیچھے دُم لہرا رہی تھی۔ میرے آتے ہی اچانک فضا اُن کے بے بیان شور و غل سے بھر گئی۔ مَیں سخت گھبرا گیا۔ اُن کی دہاڑوں، گرجوں، چنگھاڑوں، بانگوں اور ڈکاروں سے یوں لگ رہا تھا کہ دوزخ پھوٹ کر ہنس رہا ہو۔ لیکن جو بات وہ کہہ رہے تھے اُس سے میرے دانت بجنے لگے۔ وہ چیخ رہے تھے، "وہ آ گیا ہے!" اُن کی لڑکھڑاتی ناچ مزید تیز ہوگئی۔ ساتھ ساتھ لاشوں کا تعفن پھیل گیا۔

"خاموش!" ناگہاں سکوت طاری ہوگئی۔ اُن عجیب غولوں کے درمیان ایک آدمی کالا زرہ بکتر پہنے ہوئے کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ خوش نما تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں سے ظلم، گھمنڈ اور سختی ٹپک رہی تھی۔

"بیٹا، اِدھر آؤ،" اُس نے حکم دیا۔

مَیں سہم گیا۔ دل بھاگنا چاہ رہا تھا لیکن اُس آدمی کے رُعب سے میرا جسم ہچکچانے لگا۔

"آؤ تو سہی!" اُس نے دہرایا تو مَیں بے اختیار قریب آیا۔

"کہاں جا رہے ہو، بیٹا ؟" اُس نے پوچھا۔ "اور یہ کیا ہے؟"

مَیں نے نیچے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ یہ کیا جادو تھا ؟ مَیں نے بے اختیار اپنی تلوار میان سے کھینچ لی تھی۔

"یہ کہاں سے ملی ہے؟" غولوں کے راہنما نے بے صبری سے پوچھا۔ "کتنی خوب صورت ہے۔ مجھے دکھاؤ۔" وہ آگے جھپٹ کر تلوار کو پکڑنے کو تھا کہ منہ سے چیخ نکلی۔ "آہ!" تلوار کو چھوتے ہی وہ پیچھے لپکا، یوں جیسے تلوار سلگتا انگارا ہو۔ درد سے اپنے ہاتھ کو مَل مَل کر اُس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے شکار کی سی جھلک آئی۔ پھر اُس نے سنبھل کر کہا، "کہاں سے آئے ہو، بیٹا ؟"

"پہاڑ کی دوسری طرف سے۔ ہم بادشاہ سلامت کے حضور آنا چاہتے ہیں،" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"بادشاہ؟ کون سا بادشاہ؟ کیا تم نے کبھی دیکھا کوئی بادشاہ؟" سارے غول ٹھہاکے مارنے لگے۔ فضا اُن کے شور شرابے سے لرز اُٹھی۔

"خاموش!" راہنما کی گرج سے سکوت دوبارہ طاری ہوگئی۔

مَیں نے اپنا اکیلاپن شدّت سے محسوس کیا۔ کون میری مدد کے لئے آئے گا ؟ وسیم اور انور میرے جانے سے ناواقف ہوں گے۔

"وہی بادشاہ جس نے اپنے فرزند کو دشمن کے ملک میں بھیج دیا۔ جسے مارا گیا،" مَیں نے جواب میں کہا۔

"فرزند؟ مارا گیا ؟ یہ کیا حماقت ہے؟ کس نے تم کو ایسی بے وقوفیاں سکھائیں؟" اُس نے جوش میں آ کر اپنی ذاتی تلوار کو کھینچ کر ہَوا میں لہرایا۔

مجھے خیال آیا، "شاہزادے کا ذکر سنتے ہی وہ اِتنے طیش میں کیوں آتا ہے؟"

"یہاں صرف ایک حکومت چلتی ہے۔ یہاں میری ہی سنی جاتی ہے اور بس۔ کسی اَور کی نہیں۔ سمجھ گئے؟" وہ گرجا۔

مَیں خاموش ہو گیا۔

پھر رئیس کچھ ٹھنڈا ہو کر نرمی سے بولنے لگا جیسے کسی بے وقوف بچّے کو سمجھا رہا ہو، "دیکھو، بیٹا۔ عقل استعمال کر کے ذرا سوچو۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ کیا تم نے پہلے کبھی کوئی ایسی بات دیکھی یا سنی ہے؟ کیا کوئی بادشاہ اپنے فرزند کو دشمن کے ملک میں بھیجے گا تاکہ اُسے قتل کیا جائے؟ اور اگر ایسا کرتا بھی تو کیا اُس کا مشن فضول نہ ہوتا؟"

"یہ ... یہ تو سچ ہے،" مَیں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "مطلب ہے کہ کوئی بادشاہ نہیں ہے؟"

"کیا تم نے اُسے کبھی دیکھا ہے؟ یہ تو دادی امّاں کی فضول کہانیاں ہیں۔ بوڑھی عورتوں کے کمزور دماغوں سے اُبھر آئی ہیں نا۔"

مَیں نے مدد کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ہاں، ویسے ہی ہو گا،" مَیں نے سوچا۔ پھر اچانک ایک خیال آیا، "اُس کا محل ... مَیں نے تو اُسے محل میں دیکھا۔"

"خواب دیکھا تو کیا؟ خیالی پلاؤ ہے۔"

"کوئی شاہزادہ نہیں؟"

"یقین جانو، اگر کوئی بادشاہ نہیں ہے تو شاہزادہ کیسا ؟ ہاں، ٹھہرو۔ کافی سال پہلے کی بات ہے کہ ایک آدمی کو لوگوں سے پھانسی دی گئی۔ لیکن وہ تو کوئی گنوار تھا جس نے ناجائز اور بے تُکی سی باتیں سنائیں۔"

میرا تنہائی کا احساس بڑھ گیا۔ جیسے ساری دنیا نے مجھے چھوڑ کر رد کیا ہو۔ کیا سب کچھ فضول تھا ؟ کیا یہ سفر بے مقصد تھا ؟

"ٹھپ!" کوئی چیز میرے پاؤں میں گر گئی۔ نیچے دیکھا۔ میرے بے حس ہاتھ سے تلوار پھسل گئی تھی۔

"چھوڑ دو اِسے،" سرکار نے کرخت آواز میں کہا۔ "یہ کیسے کام آئے گی تمہیں ؟"

"منظور! اے منظور!" قریب سے کسی کی آواز بلند ہوئی۔ تب بیربل دوڑے ہوئے نظر آیا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے دل چسپی سے یہ ماجرا دیکھا، پھر بولا، "مل گیا آپ کو۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ آپ بھی طارق کی طرح گم ہو جائیں گے۔ کیا یہ آپ کے نئے یار بیلی ہیں؟ بہت خوب، بہت خوب۔ کیسے انوکھے دوست ہیں۔ اور سردار صاحب بھی ساتھ

... ارے، آپ کی تلوار زمین پر پڑی ہے۔ اِسے سنبھال کر رکھنا۔" اُس نے اُسے مجھے تھما دیا۔ "میرے چچا رامن کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔"

"اچھا؟ اُس نے کیا کہا؟"

"وہ جہاں بھی جاتے ہمیشہ موٹا ڈنڈا ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ایک دن وہ لاٹھی کو بھول کر گئے تو شہد کی مکھیوں کے ایک چھتے سے گزرے۔ یہ دیکھ کر اُنہیں بڑا لالچ آیا۔ 'بیربل بیٹے، وہ کہا کرتے تھے، شہد ایک بڑی اچھی چیز ہے۔' نہ ڈنڈا تھا نہ کوئی اَور چیز جس سے چھتے کو اُتارے۔"

"پھر کیا کیا؟"

"تب اُنہوں نے جرأت کرکے اُسے اپنے ہاتھوں سے اُتارا۔ حشر ہوا۔ اُن کے سوجھے ہوئے چہرے کو دیکھ کر چچی کو بڑا غصہ آیا۔ 'بیربل بیٹا، وہ کہا کرتے تھے۔ 'دھوئیں اور ڈنڈے سے چھتے کو اُتارنا ہے۔ خالی ہاتھوں سے نہیں'۔"

سردار بیربل کی سنی اَن سُنی کرکے بے صبری سے بولا، "چھوڑ دو اِسے توسہی۔" اب اُس کی آواز میں دھمکی کی جھلک آ گئی۔ "ورنہ ..."

لیکن تلوار کے دستے کو چھوتے ہی میرے جسم میں طاقت کی زوردار لہر آ گئی۔ حیران ہو کر مَیں نے پھل پر نظر ڈالی۔ یہ کیا ماجرا تھا ؟ اُس پر جلتے حروف میں لکھا تھا، "راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں۔"

"کمال ہے۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟" مَیں بولا۔

سرکار کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا، اور وہ حاکمانہ چلّایا، "فوراً اِسے پھینک دو!" سارے غول آہ و نالہ کرنے لگے، لیکن اب اُس نے اُنہیں نہیں روکا بلکہ مجھے گھورتا رہا۔

"کیوں؟" مَیں نے جرأت کر کے کہا۔ عجیب بات ہے کہ اب میرا ڈر جاتا رہنے لگا۔

"ہاں، کیوں؟" بیربل نے حیرانی سے پوچھا۔

سرکار دھمکیاں دیتے ہوئے میری طرف لپکا۔ دوسری ہستیاں بھی ہمیں گھیرنے لگیں۔ فضا اُن کے شور اور بدبو سے بھر گئی۔ گو مجھے گھٹن سی محسوس ہوئی لیکن میرا حوصلہ بڑھنے لگا۔ اگرچہ مَیں تلوار کو استعمال کرنے میں ماہر نہیں تھا تو بھی مَیں نے کوشش کر کے اُسے خوب ہَوا میں لہرایا۔

ناگہاں کہیں بادل زور سے کڑکے۔ اِس کے بعد خاموشی ہی خاموشی۔ مَیں نے پلکیں جھپکیں۔ سارے غول سردار سمیت غائب ہو گئے تھے۔ آگ بجھ گئی۔ چاروں طرف دوبارہ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مجھے چکر آئے اور مَیں بے ہوشی کی مہربان گود میں گر گیا۔

پراسرار مظلوم

مَیں نہ جانے کتنی دیر سرد ریت پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب ہوش میں آیا تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا، چاند اور ستارے بادلوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ اُس ویران و سنسان جگہ میں ہلکی سی ہَوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پوری دنیا مُردہ پڑی ہو۔ صرف بیربل کی سانس سنائی دے رہی تھی جو قریب ہی لیٹے سویا ہوا تھا۔

یکا یک مَیں گہری نیند سو گیا۔ تب میری سُنّ آنکھوں کے سامنے سے ایک ڈراؤنا خواب گزرنے لگا۔ قریب ہی لکڑی کا کھمبا زمین میں ٹھونکا گیا تھا۔ وہ معمولی لکڑی کا کھمبا تھا، لیکن جب مَیں نے اُس پر زیادہ

دھیان دیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کوئی ادھ موئی شکل اُس سے لٹک رہی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں میں موٹے موٹے کیل ٹھونکے گئے تھے۔ لاتعداد چوٹوں سے خون کی بوندیں ٹپکتے ٹپکتے زمین پر گر رہی تھیں۔ دل نہیں کرتا تھا، تاہم مَیں اُس مصیبت زدہ شکل کو تکتا رہا۔ ”کسی مجرم کو سزا ملی ہو گی،“ مَیں نے ہم دردی سے سوچا۔

اچانک اُس کا سر میری طرف مڑا تو مَیں چیخ اُٹھا۔ مَیں اُس چہرے سے خوب واقف تھا۔ یہ تو میرا اپنا ہی چہرہ تھا۔ مَیں بے اختیار چلایا، ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسی ظالم سزا کہاں اور مَیں کہاں؟ بے شک مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اِتنی سخت سزا کیوں؟ کیوں؟“ میرے الفاظ بیابان کے اندھیرے میں گونجتے گئے۔ ”کیوں ... کیوں ...“

تب مجھے شہزادے کا محل یاد آیا۔ اُن کی مقدّس حالت، اُن کی پاکیزگی، ہاں اُن کی پاک محبت بھی۔ اُن کی حضوری میں میری گندی، ناپاک اور قصوروار حالت کتنی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ مَیں غم سے بولا، ”ہاں، یہ سچ ہے۔ مَیں ناپاک ہوں۔ مَیں نالائق ہوں۔“ اِس خیال کے بوجھ تلے دب کر مَیں زور سے کراہنے لگا۔

اچانک بادل گرجے، اور ایک سخت آواز پکاری، "جرم کی سزا موت ہے۔"

مَیں گھبرا گیا۔ "ہاں،" مَیں نے سوچا۔ "مَیں سچ مچ موت کا حق دار ہوں۔" مَیں مایوسی سے رو پڑا۔ اب کیا سہارا تھا ؟

سسکیاں بھرتے بھرتے اچانک میری نظر زمین پر پڑی۔ وہاں کوئی چیز چمک رہی تھی۔ بہتے آنسوؤں کو پونچھ پونچھ کر مَیں دیکھنے کے لئے جھک گیا۔ میری تلوار چمک دمک رہی تھی۔ "راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں،" مَیں نے پڑھا۔ حروف آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ اُنہیں پڑھ کر میرا حوصلہ تھوڑا سا بڑھ گیا۔ مَیں نے اُسے پکڑ لیا اور جرأت کر کے اپنی آنکھیں اُٹھائیں۔ تب میرے رونگٹے نئے سرے سے کھڑے ہو گئے۔ وہی شکل لٹکی ہوئی تھی لیکن میرا نہیں، کسی اَور کا چہرہ نمودار ہوا۔ اُس میں جان کنی اور دکھ کے سخت نشان گڑھے ہوئے تھے۔ لیکن درد بھری آنکھیں پیار کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کہاں دیکھا اُسے،" مَیں نے سوچا۔ پھر بھوچکّا ہو گیا۔ اُسی شاہزادے کا چہرہ تھا جس کے محل میں مَیں ناجائز طور سے گھس آیا تھا۔

"آپ؟" مَیں نے آنکھیں مَل کر دوبارہ غور سے دیکھا۔ وہ خاموش رہے، لیکن اُن کے ترس اور رحم نے میرے دل کو چھید دیا۔ مَیں اُن کی محبت بھری نگاہ کیسے بیان کروں؟

"لیکن کیوں؟" مَیں چیخا۔ "کیوں؟"

اُن کا منہ کھل گیا لیکن کوئی آواز نہ نکلی ... ہونٹوں پر دھیان دیا تو دو الفاظ زیرِلب دہرا رہے تھے، "تیرے لئے۔ تیرے لئے۔ تیرے لئے۔"

میرے دل میں شک اور بے یقینی زور سے پیار کے جذبات کے ساتھ ہاتھا پائی کرنے لگی۔ مَیں کافی دیر تک اِس کشمکش میں مبتلا رہا۔ ساتھ ہی میرے اندر سے ایک دھیمی سی آواز اُبھرنے لگی۔ ایک آواز جو کہہ رہی تھی، "میرے پاس آ! مَیں تجھے آرام دوں گا۔ میرا جوا ملائم اور میرا بوجھ ہلکا ہے۔"

پھر کھمبے کے پیچھے سورج طلوع ہونے لگا۔ جب اُس کی کرنوں نے خون کے ٹپکتے قطروں کو چھو دیا تو وہ دہکنے لگے۔ دہکتے دہکتے پورا جسم

ستارہ بن گیا۔ کھمبے سے آزاد ہو کر وہ ہولے ہولے اُڑتے اُڑتے غائب ہو گیا۔ بادل پھر زور سے کڑکے۔

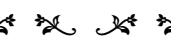

مَیں جاگ اُٹھا۔ آنکھیں مَلیں۔ سورج نکلا تھا۔ قریب ہی راکھ کا ڈھیر پڑا تھا۔ کوئی چیز میری کمر کو چبھ رہی تھی۔ ٹٹول کر پتا کیا تو تلوار کا دستہ تھا۔ ”راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں،“ مَیں نے دھیمی آواز میں پڑھا۔ قریب سے کوئی زوردار خراٹے مار رہا تھا۔ بیربل زمین پر لیٹے گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔

”اوئے“ انور اور وسیم ریت کے ٹیلے کے پیچھے سے نمایاں ہوئے۔ وہ دوڑے ہوئے ہمارے پاس آئے۔

شہرِ عیاش

"انور،" مَیں نے کہا۔ "'مَیں' کا کیا مطلب ہے؟"

ہم ریگستان کے کنارے تک پہنچ کر ہرے بھرے پودوں اور پیڑوں کے جھنڈوں میں سے گزرنے لگے تھے۔ ریت کے بعد یہ کتنے خوب صورت اور خوش گوار لگ رہے تھے۔ پنچھیوں کی نغمہ سنجی سے ہمارے دل تر و تازہ ہوئے۔

"مَیں؟" انور کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"تلوار پر لکھا ہے کہ 'راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں۔' 'مَیں' کون ہے؟"

انور نے بڑے احترام سے کہا، ''مَیں' سے مراد ہمارے شہزادہ ہے۔ انسان صرف اُن ہی کے وسیلے سے بادشاہت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم نے کل آپ کو بتایا تھا نا کہ اُنہیں دشمن کے ملک میں قتل کیا گیا۔''

مَیں نے سر ہلایا۔

وسیم نے وضاحت کی، ''بادشاہ سلامت کے راستے ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اُن کی لاش کو غار میں رکھا گیا، اور دشمن نے اُس پر پہرے داروں کی ڈیوٹی لگائی۔ پھر بھی وہ معجزانہ طور پر دوبارہ زندہ ہوئے۔ اُس وقت ظاہر ہوا کہ حقیقت میں بادشاہ کا مقصد شہزادے کی موت سے ہی پورا ہوا۔'' وہ چند لمحوں کے لئے چپ رہا۔ ''اُنہوں نے نہ صرف بادشاہت کا راستہ دکھایا۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے حوالے لوگ اِتنے خراب اور بگڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی طاقت سے بادشاہت میں نہیں پہنچ سکتے۔ اکیلا وہی بادشاہت میں داخل ہو سکتا ہے جو سراسر پاک اور گناہ سے آزاد ہو۔ سب سے معصوم بچہ بھی اِتنا پاک نہیں کہ وہ بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق ہو۔ سب کے سب سزا کے لائق ہیں۔

انور نے بات جاری رکھی، ”بات یہ ہے کہ بادشاہ نہ صرف پاک ہیں بلکہ وہ بڑے رحم دل بھی ہیں۔ وہ لوگوں کو دشمن کے قبضے میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن شاہی قانون کا تقاضا یہ تھا کہ ہر شہری بادشاہ جیسا پاک اور بے گناہ ہو، اور اِس میں لچک ممکن ہی نہ تھی۔ وہ کیا کر سکتے تھے؟ یہ بڑا اُلجھا ہوا مسئلہ تھا۔ آخر میں شہزادے نے ایک نہایت مشکل قدم اُٹھایا تاکہ لوگوں کو دشمن کے حوالے سے چھڑائیں۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو قربان کیا۔ وہ نہ صرف اِس لئے دشمن کے ملک میں گئے کہ لوگوں کو بادشاہت کا راستہ دکھائیں۔ بلکہ جانے کا ایک اَور مقصد تھا، ایک حول ناک مقصد۔ وہ جانتے تھے کہ اُنہیں اپنی جان کو قربان کرنا ہے۔ کہ وہ انسان کی سزا اپنے اوپر اُٹھائیں گے تاکہ بادشاہت کا راستہ اُن کے لئے کھل جائے۔ صرف اِسی طریقے سے بادشاہت کا قانون پورا ہو سکتا تھا۔“

ہم خاموشی سے آگے بڑھے۔ ہر ایک اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ چلتے چلتے سامنے ایک شہر نظر آیا۔

”اِس شہر کا کیا نام ہے؟“ بیربل نے پوچھا۔

"عیاش،" بونے نے جواب دیا۔ "لازم ہے کہ ہم اُس میں سے گزریں۔ لیکن خبردار۔ یہاں کے باشندے بڑے بدمعاش ہیں۔"

ہم قریب آئے۔ پھاٹک کے اندر ایک استقبالیہ کمیٹی کھڑی تھی۔

"خوش آمدید، خوش آمدید،" وہ پکارے اور ہمارے گلوں میں ہار ڈالے۔

"اِن کی مت سننا،" انور نے زیرِلب کہا۔

"کیوں نہیں؟" مَیں نے لاپروائی سے پوچھا۔ حقیقت میں شہر کی گہما گہمی دیکھ کر مَیں بڑا خوش ہو گیا تھا۔

بیربل نے چہکتے ہوئے اپنا ہار اُتار کر ایک گزرنے والے گدھے کے گلے میں ڈال دیا۔ "یہ زیادہ اِس کے لائق ہے،" وہ بولا۔ "اور سوچ لو، یہ اِسے بعد میں کھائے گا بھی۔ ڈبل فائدہ ملے گا۔"

ایک بڑا سا میلا عروج پر پہنچ گیا تھا۔ گلیوں میں لوگ دیوانہ ہو کر ناچ رہے تھے۔ ڈھولکوں کی آوازیں شہر کے کونے کونے سے گونج رہی تھیں۔ ہر چوک میں بازی گر اور فال کھولنے والے اپنی مہارت دکھاتے ہوئے ہجوم کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ پھیری والے بازار کی

رونق میں اضافہ کر رہے تھے جبکہ بھکاری اور جیب کترے تماشائیوں کی جیبیں ہلکی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

ہم ایک دکان سے گزر رہے تھے کہ ایک لڑکی نے مجھے آنکھ ماری۔ مَیں ٹھٹھک کر رک گیا۔ بیربل کہنے لگا، "چچا رامن کی بات یاد آتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے، 'بیربل بیٹا، اجنبی عورت سے بات تک مت کرنا'۔"

"یہ کیوں؟" مَیں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ایک بار وہ کشتی میں ایک دریا کو پار کر رہے تھے تو ایک اجنبی عورت سے بات کرنے لگے۔ وہ عورت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ اُس کی چکنی چپڑی باتوں سے چچا بڑے خوش ہوئے۔ اُنھوں نے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں بتایا، وہ عورت بھی کوئی رام کہانی سنانے لگی۔ جب دوسرے کنارے پر سفر جاری رکھا تو کیا دیکھتا ہے۔ بٹوا غائب، وہ عورت بھی غائب۔ 'بیربل بیٹا،' وہ کہا کرتے تھے، 'مَیں اپنی گھر والی کو کیا بتاؤں؟ کہ ایک عورت نے میرا بٹوا چھین لیا؟ گھر پہنچ کر بڑی دقت ہوئی'۔"

ہم آگے بڑھے۔ راستوں کے کناروں پر لگی ریہڑیاں اور ہوٹل اپنے لذیذ کھانوں کی خوش بوؤں سے بھیڑوں کو لُبھا رہے تھے۔ ہم منہ پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر گھومے پھرے۔ مَیں نے کبھی اِتنی آب و تاب نہیں دیکھی تھی۔

ایک چوک میں ایک جادوگر اپنا فن دکھا رہا تھا۔ جب قریب آئے تو وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا، "حضرات، تاش کا یہ پتا دیکھو۔ مَیں اِسے اپنی جیب میں ڈال دیتا ہوں۔ اب گزارش ہے کہ آپ میرے پاس آؤ۔" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بیربل کو بلایا۔ بیربل جھجکتے ہوئے سامنے آیا۔ جادوگر نے اُس کی واسکٹ سے تاش کا وہی پتا نکالا۔

بیربل کو جھٹکا لگا، پھر بولا، "میرے پاس اَور بھی ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے دوسری جیب سے لمبا رنگ دار کپڑا کھینچ کھینچ کر نکال دیا اور جادوگر کے سپرد کیا۔ پھر ایک زندہ خرگوش اور ایک بٹوا۔ "کیا یہ بھی آپ کا سامان ہے؟"

اب جادوگر کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ چیخا، "چور، چور! حضرات، کیا آپ نے دیکھا اِس کو؟ اِس نے میرا بٹوا تک چوری کیا ہے۔ اُسے پکڑ لو!"

بھیڑ میں شور مچ گیا۔ ایک یہ کہنے لگا، دوسرا وہ۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے بلکہ کچھ غلطی سے ایک دوسرے سے لڑنے بھی لگے۔ ہوتے ہوتے بیربل کی لمبی پتلی شکل اور چمکتی کھوپڑی ہنگامے میں اوجھل ہوگئی۔ مَیں بھی دھکے کھا کھا کر دوسرے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ جب حالات کچھ سنبھل گئے تو وہ کب کے ہجوم میں غائب ہو چکے تھے۔ مَیں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر بے سود۔ مایوسی کے عالم میں مَیں ہجوم کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ کتنے شان دار مکان تھے۔ اُن کی کھڑکیاں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں دہک رہی تھیں۔

"آؤ بھئی، آؤ۔"

ایک عالی شان محل کے کھلے دروازے میں ایک ملازم کھڑے زور سے اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مَیں نے قریب آ کر اندر جھانکا۔ خوش و خرم لوگ عمدہ لباس پہنے منہ میں پانی بھرنے والے کھانے کھا رہے تھے۔ مَیں داخل ہو کر ضیافت میں شامل ہوا۔ کتنی رونق تھی! موسیقار ایک کونے میں میٹھے میٹھے راگ الاپ رہے تھے۔ میرے سامنے لذیذ مے جام میں چمک رہی تھی۔ کھانا کھاتے اور مے پیتے میری

پوری احتیاط جاتی رہی، اور مَیں بھی نشے میں دھت دوسروں کی طرح ہنسنے ناچنے لگا۔ پھر یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ ہاں، اِتنا مجھے یاد ہے کہ مستی میں آ کر ارد گرد کے لوگوں کی شکلیں بدلنے لگیں۔ جس عورت کے ساتھ مَیں ناچ رہا تھا اُس کی نازک ناک چونچ میں بدل گئی، اور جانور کی وحشی آنکھیں مجھے تکنے لگیں۔ ساتھ والا آدمی ایک لمحہ ٹھہا کے مار رہا تھا اور دوسرے لمحے لکڑ بگھے کی عجیب ہنسی نکال رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اُس کی لمبی ناک بڑھتی بڑھتی لکڑ بگھے کے تھوتھن میں بدل گیا۔ موسیقاروں کی طرف سے بھی عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ میٹھے راگوں کی جگہ فضا غراہٹ، دہاڑوں اور چیخوں سے بھر گئی۔ ”کیا عجب۔“ مَیں نے کاہلی سے سوچا، ”یہ کالے زرہ بکتر والے کہاں سے آ گئے ہیں؟“ پھر میرے حواس اُڑ گئے۔

جب مَیں ہوش میں آیا تو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر پڑا تھا۔ ہزار جن میرے سر کو اپنی سوئیوں سے چبھو رہے تھے۔ چاروں طرف سکوت

طاری تھی۔ صرف "ٹپ ٹپ" کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہولے ہولے مَیں اُٹھ بیٹھا۔ ایک موم بتی دیوار پر لگا ہوا تھا جس کی مدھم روشنی میں ظاہر ہوا کہ مَیں کسی کوٹھری میں پڑا ہوں۔ دیواریں گیلی تھیں، اور چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ مَیں لڑکھڑا کر دروازے کے پاس گیا۔ بے فائدہ۔ تالا لگا ہوا تھا۔ مایوس ہو کر مَیں پھر سرد زمین پر بیٹھ گیا۔ تب مَیں نے دیکھا کہ مَیں اکیلا نہیں ہوں۔

"بیربل! آپ کو بھی پکڑا گیا!" مَیں بولا۔

بیربل اپنے گنجے سر کو پکڑے کراہنے لگا۔ "ہائے، کیا ہوا؟ پہلے اِتنی رونق اور اب یہ تاریک کوٹھری۔"

"اب ہم سچ مچ پھنس گئے ہیں،" مَیں بولا۔ "کیا ہمارے ساتھیوں نے ہمیں خبردار نہیں کیا تھا؟ اب تلوار بھی گم ہوگئی ہے۔" اداسی کا عالَم مجھ پر طاری ہوگیا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے فرش پر بیٹھا رہا کہ چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ مَیں نے سر اُٹھایا۔ دروازہ چرچراتے ہوئے کھل رہا تھا۔ باہر جھانکا تو ایک چوہی دہلیز پر کھڑے مجھے تک رہی ہے۔

"بے چاری،" مَیں نے کہا۔ "ہمیں کیا بتانا چاہ رہی ہے؟"

چوہی پچھلے پاؤں پر بیٹھ کر سنجیدگی سے اپنی مونچھیں صاف کرنے لگی۔ پھر کچھ آگے جا کر دوبارہ رک گئی اور ہماری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہم تیرے پیچھے چلیں؟" مَیں نے پوچھا۔ "کیوں نہیں؟ پہلے بھی کافی عجیب و غریب باتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔"

ٹمٹماتی موم بتی اُٹھا کر ہم اُس کے پیچھے چلنے لگے۔ یوں دبے پاؤں چلتے چلتے ہم ایک چھوٹے کمرے میں پہنچے۔ اُس میں ایک گارڈ ایک میز کے پیچھے بیٹھے خراٹے مار رہا تھا۔ خراٹوں کے طوفان سے اُس کی لمبی لمبی مونچھیں زور سے ہل رہی تھیں۔ لیکن میز پر ایک چیز چمک رہی تھی جسے دیکھ کر میرا دل اچھل پڑا: میری تلوار! پھل پر وہی الفاظ دہک رہے تھے، "راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں۔" مَیں نے آگے لپک کر اُسے خاموشی سے پکڑ لیا۔ اُسے چھوتے ہی میرا حوصلہ بڑھنے لگا۔

مَیں آگے نکلنے والا تھا کہ بیربل نے اشارے سے مجھے روکا۔ وہ جھک گیا، اور مَیں نے دیکھا کہ وہ گارڈ کے تسمے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رہا ہے۔ لیکن اُس عجیب بندے نے ایک اَور کام کیا۔

میری تلوار لے کر گارڈ کی مونچھیں کاٹ ڈالیں۔ ”اب طوفان کے زور سے کچھ نہیں ہو گا،“ اُس نے سرگوشی کی۔

ہم آگے چل کر ایک گلیارے میں سے گزرنے لگے۔ چلتے چلتے گلیارا ختم ہوا۔ اچانک چوہی اوجھل ہوگئی۔

”یہ کیا جادو ہے؟“ مَیں نے زیرِلب کہا۔ قریب آ کر دیوار کو جانچنے لگا۔ اُنگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر ایک چھوٹی سی دراڑ معلوم ہوئی۔ ”ہم اِس میں سے کیسے نکلیں گے؟“ مَیں نے موم بتی کو قریب لا کر دھیان سے دیکھا۔

”اوئے!“ اچانک ہمارے پیچھے ایک کرخت آواز گرجی۔ سر مڑا تو گارڈ کا غصے سے لال پیلا منہ دکھائی دیا۔ وہ ہانپتے ہوئے ہماری طرف لپکنے کو تھا کہ بندھے ہوئے جوتوں کے باعث دھڑام سے گر گیا۔

گارڈ کو دیکھ کر بیربل دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے تلوار کو مجھ سے چھین کر دراڑ میں ٹھونس دیا، پھر وحشت سے اُسے چوڑی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ یکایک دراڑ بڑھنے لگی اور بڑھتی بڑھتی اِتنی چوڑی ہوگئی کہ ہم آسانی سے گزر سکے۔ گارڈ دہاڑیں مار مار کر ہم پر جھپٹ پڑا، لیکن عین وقت پر

ہم دراڑ میں گھس کر بچ گئے۔ دراڑ چپکے سے ہمارے پیچھے بند ہوگئی۔ گارڈ کی گرجیں دھیمی ہوگئیں۔ ہم اپنی پلکیں جھپکنے لگے۔ ہمارے سامنے بڑی سرنگ تھی جس کی دیواریں کسی قدرتی چیز سے چمک رہی تھیں۔ کچھ آگے لوگوں کا ایک گروہ سادے سے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے۔

"خوش آمدید" ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

"آپ کون ہیں؟" حیرانی کے باعث مَیں ادب سے بات کرنا بھی بھول گیا۔

"ہم شہر کے اصل باشندے ہیں،" وہ بولا۔ "شروع میں یہ بادشاہ کا گڑھ تھا۔ لیکن ہماری لاپروائی کے باعث دشمن کے ایجنٹ اِس میں گھس آئے، اور دھیرے دھیرے لوگوں کا رخ بادشاہ کے خلاف ہوا۔ اب یہ چند سال ہوئے دشمن کے قبضے میں آ گیا۔ ہم جو تھوڑے بہت رہ گئے ہیں اِس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ جتنے ہو سکے لوگوں کو بچائیں۔" چند لمحوں کے لئے خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ "اب جلدی سے

چلے جائیں۔ دشمن کے جاسوس ہر طرف موجود ہیں۔" خوشی سے پھولے نہ سما کر ہم بزرگ کے پیچھے چل دیئے۔

شاید ہم گھنٹا بھر یوں مدھم سی قدرتی روشنی میں پھرے، پھر سرنگ کا منہ نظر آیا۔ جب نکلے تو جنگل کا منظر نمودار ہوا۔ تڑکے کا وقت تھا، اور دو شکلیں نظر آئیں جن سے ہم خوب واقف تھے۔ "انور! وسیم!" مَیں پکارا۔

کوہِ دانش

ہم آگے نکلے۔ اب پہاڑی علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ چلتے چلتے پسینہ آنے لگا۔ انور "کاؤں کاؤں" کرتے ہوئے ہمارے ارد گرد پرواز کر رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک پہاڑ کے دامن میں رک گئے۔

"یہ کیسا پہاڑ ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"لوگ اِس کو کوہِ دانش کہتے ہیں،" وسیم نے کہا۔

"کیا یہ پہاڑ خطرناک ہے؟" اب مَیں کچھ زیادہ محتاط ہونے لگا تھا۔

وسیم ہنستا ہوا بولا، "ایک لحاظ سے یہ ضرور خطرناک ہے۔ صرف وہ جسے چڑھنے کا اچھا خاصہ تجربہ ہے کامیاب رہتا ہے۔ چڑھنے کا ماہر تو اپنی

حدوں کو جانتا ہے۔ وہ نہ صرف ہر خطرے سے واقف ہے بلکہ اپنے جسم کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی۔ ایک ہی غلطی کافی ہے کہ پھسل کر کسی کھڈ میں جا گرے۔"

مجھے پہلے سے چڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ مَیں بولا، "مَیں کوشش تو کروں گا۔"

"مَیں بھی ساتھ جاؤں گا،" بیربل چہچہایا۔

ہمارے ساتھی ہچکچاتے رہے، لیکن میری ضد کو دیکھ کر اُنہوں نے مجھے چڑھنے دیا۔ وسیم بولا، "لیکن آنکھ کھلی رکھنا۔ پہاڑ کی چوٹی پر آکسیجن بہت کم ہے۔ اکثر لوگ اگر دیر سے چوٹی پر ٹھہریں بیمار بلکہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ بہتوں کو یہ بیماری محسوس بھی نہیں ہوتی، اور جب اُترنے کی کوشش کرتے تو اُن کا جسم جواب دے جاتا ہے، اور وہ وہیں کے وہیں مر جاتے ہیں۔"

ہم اُنہیں وہاں آرام کرتے چھوڑ کر چڑھنے لگے۔ ڈھلان چڑھنا سچ مچ دشوار تھا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے بڑا مزہ آیا۔ چڑھتے چڑھتے دُور تک ارد گرد کے دیہات نمودار ہوئے۔ میری سانس پھولنے لگی لیکن اب مزید

معلوم کرنے، مزید دریافت کرنے کا لالچ میرے دل پر غالب آیا تھا۔
"بے شک یہاں سے بادشاہ کا محل نظر آئے گا،" مَیں نے سوچا۔ کچھ اَور چڑھا تو اونچائی کی وجہ سے چکر آنے لگے۔

"اب مَیں آگے نہیں جا سکتا،" بیربل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ بڑے پتھر پر بیٹھ گیا جبکہ مَیں قدم بہ قدم لڑکھڑاتے ہوئے آخر میں چوٹی پر پہنچ گیا۔ کتنی خوشی کا احساس ہوا۔ روئے زمین میرے نیچے پھیلی ہوئی تھی۔ پیچھے ریگستان کی ریت دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ سامنے جنگلی پہاڑیاں کسی دیو سے ترتیب سے تہہ کی گئی تھیں۔ لیکن افسوس—جہاں بھی دیکھا بادشاہ کا کوئی محل نظر نہ آیا۔

چوٹی پر مجھے دھوپ کی تیزی محسوس ہوئی۔ میرے اوپر ایک ننھی سی سفید بدلی نیلے نیلے آسمان کو سُستی سے عبور کر رہی تھے۔ یکایک کسی کی جوشیلی آواز سنائی دی۔ مَیں نے نیچے جھانکا۔ ایک ہٹا کٹا آدمی گنگناتے ہوئے میرے پاس چڑھتا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ادب سے سلام کیا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

مَیں نے اپنے پچھلے تلخ تجربات یاد کر کے گول مول سا جواب دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے دل چسپی سے تلوار کی طرف اشارہ کیا۔

"میری تلوار، اور کیا؟"

"ارے، بے شک تلوار ہے۔ لیکن کس مقصد کے لئے؟"

"ظاہر ہے کہ یہ میری حفاظت کے لئے ہے۔"

"اچھا ... تو اِس پر کیا لکھا ہے؟"

"راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں۔"

"اِس کا کیا مطلب؟"

لگتا تھا کہ وہ بُری نیت سے نہیں پوچھ رہا ہو، اِس لئے مَیں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا، "مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ شہزادے کے اپنے بارے میں الفاظ ہیں۔"

"کمال ہے!" وہ خوشی سے چہچہایا۔ "بات سنیں۔ میرے پاس ایک چیز ہے جو آپ کو بہت کام آئے گی۔" اُس نے اپنی تھیلی میں ٹٹول ٹٹول کر ایک خوب صورت چادر نکالی۔ کچھ حروف بڑی مہارت سے کپڑے میں کاڑھے گئے تھے۔

"ہماری عظیم تہذیب کے نام،" مَیں نے پڑھا۔

"آپ اِسے لے لو۔ میری طرف سے مفت۔ اِس قدر خوب صورت تلوار کو میان کے علاوہ کسی اچھے کپڑے میں بھی لپیٹنا چاہیئے۔"

مَیں نے سوچا، "اُس کی یہ بات سچ ہے۔ ایسی خوب صورت تلوار کو اِس جیسی اچھی چادر کے لائق ہے۔"

"بہت شکریہ،" مَیں نے کہا اور تلوار کو میان سمیت احتیاط سے چادر میں لپیٹ کر کمر سے باندھ لیا۔

"اب آپ اِس کو بہترین طریقے سے سنبھال سکیں گے۔ اور یہ بھی ساتھ لے کر چلیں۔" اُس نے مجھے ایک کالی سی لاٹھی دی جس کا دستہ عقاب کے چنگل کی شکل میں تراشا ہوا تھا۔ اُس پر لکھا تھا، "ہماری عظیم قوم کے نام۔" پھر وہ الوداع کر کے پہاڑ کی دوسری طرف اُتر گیا۔

مَیں خوش ہو کر چوٹی سے اُترا۔ "دنیا کی بُرائی کے باوجود کچھ نیک لوگ بھی باقی رہ گئے ہیں،" مَیں نے سوچا۔ جب پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو پکارا، "اوئے، انور! وسیم! بیربل!" پہاڑ کی طرف سے میری آواز کی بازگشت گونجی، "انور ... انور ... وسیم ... وسیم ... بیربل ... بیربل ..." لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

غار

مَیں نے چاروں طرف دیکھا۔ بونا اور کوّا کہاں تھے؟ بیربل کا بھی نام و نشان نہ تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی شکل نظر آئی۔ "وسیم!" مَیں نے خوشی سے پکارا اور اُس کے پاس لپکا۔ لیکن وسیم نہیں تھا۔ کوئی اَور بونا تھا، جس کے لمبے کالے بال اور کالی داڑھی کمر تک پہنچتی تھی۔ وہ پیڑ کے مُڈھ پر بیٹھے چھری سے لکڑی کا ٹکڑا تراش رہا تھا۔ جب غور کیا تو دیکھا کہ وہ ایک ڈراؤنے اژدہے کی شکل تراش رہا ہے۔

میرے سلام پر اُس نے تعجب سے پوچھا، "آپ یہاں کیوں اکیلے پھر رہے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ جگہ بہت خطرناک ہے؟ یہاں قریب ہی اژدہے کا اڈا ہے۔ وہ روزانہ اِسی پہاڑ کے دامن میں شکار کرنے گھومتا پھرتا ہے۔ یہاں کئی ایک چڑھنے والوں کا انجام ہوا ہے۔ مَیں بھی صرف اِسی لئے یہاں بیٹھا ہوں کہ لوگوں کو خبردار کروں۔ لیکن لگتا ہے کہ آپ میری غیرموجودگی میں آگے نکلے تھے۔"

مَیں سخت گھبرا گیا۔ مجھے چکر آنے لگے، اور دل کرتا تھا کہ سیدھے بھاگ جاؤں۔ تب میرے ساتھی یاد آئے۔ اُنہیں مَیں کیسے چھوڑ کر آگے بڑھ سکتا تھا؟ مَیں نے پوچھا، "اژدہے کا اڈا کہاں ہے؟"

بونے نے لکڑی کے ٹکڑے سے اشارہ کیا، اور مَیں اُس طرف بڑھا۔ کچھ فاصلے پر بیربل کی لمبی پتلی شکل نظر آئی۔ وہ زمین کی طرف جھکا ہوا کسی چیز پر غور کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے بے قراری سے زمین کی طرف اشارہ کیا، "یہ دیکھو!"

کسی بھاری جانور کے لمبے چوڑے نقشِ قدم دکھائی دیئے۔

ہم ڈرے ہوئے اُن کا کھوج لگانے لگے۔ اُن کے پیچھے چلتے چلتے ہم سیدھے پہاڑی جنگل کی ایک ویران جگہ پر پہنچ گئے جہاں ایک غار کا منہ نمودار ہوا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ ہم دبے پاؤں منہ پر پہنچے۔ لیکن جب اندر جھانک ماری تو دھچکا لگا۔ آنکھیں ملیں۔ اندر کوئی وحشی درندہ نظر نہ آیا بلکہ ایک خوش نما گول کمرہ۔ پچھلی طرف آتش دان میں آگ خوب بھڑک رہی۔ اُس پر کیتلی بلبلے اُٹھاتے ہوئے کھلکھلا رہی۔ سامنے کمرے کے بیچ میں ایک بزرگ عالم میز پر بیٹھا کوئی موٹی موٹی کتاب پڑھنے میں غرق تھا۔ بار بار اُس کی عینک لمبی ناک پر سے پھسلتی رہتی تو وہ ایک اُنگلی سے اُسے واپس اپنی جگہ پر لگاتا۔ مغربی لباس پہنے اور چھوٹی مونچھیں رکھے وہ بڑا دانش مند لگتا تھا۔ گود میں ایک کالی بلی بڑے اطمینان کے ساتھ خرخرا رہی جبکہ کرسی کے پیچھے دیوار سے لگی لکڑی کا بڑا گھڑیال کھٹ کھٹ کر رہا تھا۔ یہ پُرسکون ماحول دیکھ کر ہم دونوں کنفیوز ہو گئے۔ ہمارے دوست کہاں ہیں؟ درندہ کہاں غائب ہو گیا ہے؟

"السلام علیکم، بیٹو۔ اندر آؤ۔"

"وعلیکم،" مَیں ادب کے ساتھ بولا اور داخل ہوا۔ بیربل بھی چہچہاتے ہوئے اندر آ کر ہر طرف دیکھنے لگا۔

"بیٹھو۔" وہ ہمارے لئے دو کرسیاں اپنے قریب کھسکا لایا۔ "کس حادثے نے تم کو اِس ویران جگہ پر پہنچایا؟" اُس نے ہمیں غور سے دیکھنے کے لئے اپنی عینک اُتاری۔

"ہم اپنے دو ساتھی ڈھونڈ رہے ہیں،" مَیں نے جواب دیا۔ "ایک بونا اور ایک کوّا۔ کیا آپ نے اُنہیں کہیں دیکھا ہے؟"

"بونا اور کوّا؟" وہ ہنس پڑا۔ "کتنے عجیب ساتھی۔ نہیں، اِدھر سے نہیں گزرے۔" پھر کچھ خاموش رہا۔ صرف آگ کی بھڑکتی اور بلی کی خرخراتی آواز سنائی دی۔

بیربل نے بلی پر ہاتھ پھیر دیا، لیکن اُس نے سسکار کر اپنے دانت نکوسے۔ بیربل نے پھرتی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ پھر چہکا، "میرے چچا رامن بھی عالم تھے، بالکل آپ کی طرح۔"

"اچھا؟" بزرگ خوش ہو کر مسکرایا۔

”ہاں، وہ بہت عمدہ قسم کے عالم تھے۔ ارے، جو کچھ بھی پوچھو وہ سب کچھ جانتے تھے۔ افسوس، دن رات کتابیں پڑھ پڑھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ ایک دن وہ اپنے کمرے سے ہنستے ہنساتے نکلے اور اعلان کیا کہ اب مجھے تمام مسئلوں کا حل معلوم ہے۔“

”سچ؟ کیا حل تھا؟“

”حل یہ تھا کہ تالاب کے مینڈکوں کی پوری پوری گنتی ہو جائے تو دنیا کے تمام مسئلے مسائل حل ہو جائیں گے۔“ بیربل نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بے چاری چچی۔ وہ بڑی پریشان ہوئی۔“

پروفیسر نے جھنجھلا کر مضمون کو بدل دیا۔ ”بیٹا۔ یہ مجھے ذرا دکھاؤ،“ اُس نے میری چادر میں لپٹی ہوئی تلوار کی طرف اشارہ کیا۔ مَیں نے جھجکتے ہوئے اپنا اسلحہ اُسے تھما دیا۔

”کتنی اچھی تلوار۔“ اُس نے چادر اُتار کر اور عینک لگا کر اُسے غور سے پرکھا۔

”ہاں، ہاں،“ بیربل پکارا، ”بہت کام آئی ہے۔“

اُس کی سنی اَن سنی کرکے بزرگ نے قرار دیا، "پرانے زمانے کی اچھی گواہی دیتی ہے۔ خیر آج کل کون اِسے استعمال کرتا ہے!"

"کیا مطلب؟" مَیں نے پوچھا۔ "اِس کا استعمال آج کل کیوں نہیں ہوتا ؟"

"جناب، یہ تو بہت ہی زیادہ استعمال ہوا ہے،" بیربل نے اعتراض کیا۔

"بے شک وہ آج کل بھی استعمال ہوتا ہے،" اُس نے میری پریشانی بھانپ کر مجھے تسلی دی۔ "لوگ اکثر اِسے پالش کرکے کمرے کو سجانے کے لئے دیوار پر لگاتے ہیں۔ تم نے خود اِسے خوب صورت چادر میں لپیٹ کر رکھا ہے۔ ظاہر ہی ہے کہ تم اِسے زیادہ تر سجاوٹ کے لئے استعمال کرتے ہو۔ نہیں، بیٹا۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یقین کرو کہ آج کے جدید دَور میں بندوق، کلاشنکوف، دستی بم جیسی چیزیں کام آتی ہیں۔ تلوار، زرہ بکتر اور ڈھال کا دَور گزر چکا ہے۔ اب یہ صرف ہماری ثقافت کا دل بہلانے کے لئے رکھی جاتی ہیں۔

"لیکن پھر شہزادے کے اِن الفاظ کا کیا مطلب ہے؟" مَیں نے پھل کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں،" اُس نے پُروقار انداز میں پڑھا، پھر جھجکا۔ "لازم ہے کہ ایک وقت تھا جب یہ فقرہ درست تھا۔ لیکن وہ زمانہ بدل گیا ہے۔" وہ نرمی سے مسکرایا۔ "دیکھو نا، مَیں نے بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ بے شمار راہنماؤں نے دعویٰ کیا ہے کہ مَیں اصلی راہ ہوں۔ کیا معلوم کہ تمہارے شہزادے کی بات صحیح ہو یا کسی اَور کا دعویٰ۔ اِس کی حقیقت کس طرح ثابت ہوسکتی ہے؟"

بیربل پروفیسر کی باتوں سے بور ہوکر کرسی سے اُٹھا اور کمرے کی چھوٹی موٹی چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

پروفیسر اپنی عینک دوبارہ اُتارکر اُسے اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے اپنی تیز اور نیلی نیلی آنکھوں سے مجھے تکتا رہا۔ مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگ کڑکڑا رہی تھی۔ بلی انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنے سر سے پروفیسر کے پیٹ کو رگڑنے لگی۔ اُس نے جواب میں اپنا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر پھیر دیا۔

"کیا تم نے اِس نام نہاد شہزادے کو کبھی دیکھا ہے؟" اُس نے خاموشی توڑ کر پوچھا۔ "پھر بھی ...پھر بھی ... فرض کرو کہ ایسا آدمی سچ مچ ہو۔ تو وہ کیسے دعویٰ کرسکتا ہے کہ مَیں واحد راہ ہوں؟ ممکن ہے کہ بہت ساری راہیں ہوں یا کہ کوئی بھی نہ ہو۔"

"یہ سچ ہے،" مَیں نے سر ہلایا۔ اُس کی دلیلیں معقول سی لگتی تھیں۔

بیربل نے بے دھیانی سے تلوار کو اُٹھا کر ہَوا میں لہرایا۔ اُس کی سنسناتی آواز کمرے میں گونج اُٹھی۔ "ٹھاہ!" میز پر رکھا گل دان دھڑام سے گر گیا۔

"ارے، دھیان سے،" بزرگ چیخا، اور مجھے لگا کہ اُس کی آواز میں ڈر کی جھلک آ گئی۔

"شوں شوں۔ کتنی اچھی طرح چمکتی دمکتی ہے،" بیربل چہچہایا۔ "ہاں، اِس نے بہت کام کیا ہے۔"

مَیں خاموش پڑ گیا۔ یوں سوچتے سوچتے اتفاقاً میری نظر گھڑیال پر پڑی۔ پرانے طرز کا گھڑیال تھا۔ اُس کی لکڑی میں عجیب و غریب شکلیں تراشی گئی تھیں۔ خاص کر ایک چہرے نے میری توجہ اپنی طرف

کھینچی۔ مَیں کہیں اُس سے واقف ہو چکا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں۔ گھڑیال کے منہ کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ مَیں نے اِس قسم کے گھڑیال ملٹری میں ہوتے ہوئے دیکھے تھے۔ عموماً ایک ننھا سا پپیہا ہر گھنٹے کا اعلان کرنے کے لئے اُس دروازے سے نکلتا ہے۔ بیربل بھی اپنی اُنگلیاں اُس پر پھیر پھیر کر اُسے غور سے دیکھنے لگا تھا۔

پروفیسر بول اُٹھا، "کیا تم نے کبھی اِس پر غور کیا ہے کہ اگر صرف ایک صحیح راہ ہوتی تو پھر دنیا کی راہیں اکثر کیوں ایک دوسرے سے جھگڑتی رہتی ہیں؟ کیا دال میں کچھ کالا نہیں؟" اُس نے دھڑام سے اپنی کتاب بند کی، "ہر کوئی اپنے من گھڑت خیالات جوڑ جوڑ کر اپنی 'راہ' پیش کرتا ہے تاکہ اُسے کچھ تسلی، کچھ سکون حاصل ہو۔"

بیربل بے دھیانی سے کہنے لگا، "میرے چچا رامن کو ایک دن ایک بڑی عجیب سی بات پیش آئی۔ اُنہیں گھنے جنگل میں سے ایک پہاڑ پر جانا تھا۔ وہ ایک چوک پر آئے جہاں سے چھ راستے آگے نکلتے تھے۔ کوئی بات نہیں، اُنہوں نے سوچا۔ مجھے شمال کی طرف جانا ہے، تو شمالی راستہ ہی اختیار کروں گا۔ اُس پر چل پڑے تو وہ ایک دم ختم

ہوا۔ تب واپس آ کر اگلی راہ چن لی۔ یہ اِدھر اُدھر گھوم کر آخر میں اُسی چوک پر واپس پہنچی۔"

"پھر کیا ہوا ؟" مَیں نے تجسس سے پوچھا۔

"شاید آپ یقین نہ کریں، لیکن ہر ایک راستے کو آزما آزما کر آخری صحیح نکلا، وہ جو بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں، میرے چچا اُس دن بہت تھکے ہارے واپس گھر پہنچے۔"

پروفیسر پھر گیا۔ وہ بے قراری سے بولا، "مہربانی کرکے تلوار کو دوبارہ میان میں ڈال کر چادر میں لپیٹ لو۔"

مَیں نے تلوار کو بیربل سے لے کر میان میں ڈال دیا اور احتیاط سے چادر میں لپیٹ لیا۔ میرے دل پر کوئی بھاری بوجھ اُتر آیا جس سے جان کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ مَیں نے آگ کی طرف دیکھا۔ "ہاں،" مَیں نے سوچا۔ "ہاں، ایسا ہی ہو گا۔ پروفیسر کی باتیں ٹھیک ہی لگتی ہیں۔" میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

لپٹی ہوئی تلوار کو دیکھ کر عالم کی بے قراری کم ہوئی۔ ”کچھ چائے پی لو،“ اُس نے کیتلی اُٹھا کر پیالے بھر دیئے اور ہمیں پدرانہ انداز میں پیش کئے۔ ساتھ ہی میز پر کچھ بسکٹ پلیٹ پر رکھ دیئے۔

بیربل آہ بھر کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی گنجی کھوپڑی آگ کی روشنی میں دمک رہی تھی، اور اُس کی لمبی پتلی ٹانگیں بے اختیار میز سے ٹکرا گئیں۔

مَیں پیالہ اُٹھا کر چائے پینے کو تھا کہ اچانک گھڑیال سے آواز آئی۔

”کتنی عجیب بات ہے،“ مجھے خیال آیا۔ ”یہ کیسا گھڑیال ہے؟ کاؤں کاؤں کی آواز نکال رہا ہے۔“

بیربل چیخ اُٹھا۔ اُس نے ٹھرٹھراتے ہاتھ سے گھڑیال کی طرف اشارہ کیا۔ مَیں چونک پڑا۔ جو پرندہ گھڑیال کے دروازے سے نکل آیا تھا اب واپس جا رہا تھا۔ یہ کوئی پپیہا نہیں تھا۔ کوّے کی شکل اوجھل ہو رہی تھی۔ مَیں نے آنکھیں مَلیں پھر دوبارہ دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ پھر یکایک مجھے ایک ہیبت ناک خیال آیا۔ تراشے ہوئے مانوس

چہرے پر دوبارہ نظر ڈالی تو اُسے پہچان لیا۔ میرے دوست وسیم کا چہرہ تھا!

میرے منہ سے چائے کا گھونٹ اُگل پڑا۔ پیالہ زمین پر کھڑکھڑایا۔ مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ مَیں نے گھبراتے ہوئے پروفیسر کو گھورا۔ اُس کی آنکھیں باہر نکلنے کو تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ پھٹیں گی۔ اُس کا چہرہ بدلنے لگا۔ گال سرخ ہو گئے۔ ناک بڑھنے لگی۔ جب نظر اُس کے ہاتھوں پر پڑی تو دیکھا کہ نوک دار ناخن اُگ رہے ہیں۔ اِسی طرح جہاں پاؤں تھے اب پنجے نظر آ رہے ہیں۔ پورا جسم بڑھتے بڑھتے بدلتا رہا۔ چند لمحوں کے اندر اندر پروفیسر ایک ہیبت ناک اژدہے میں بدل گیا۔

کالی بلی بھی غائب ہوگئی تھی۔ اُس کی جگہ ایک کالے لباس پہنے سوکھی ہوئی چڑیل کھڑی تھی۔ گھڑیال کی جگہ میرے دو ساتھی ہتھ کڑیوں سے بندھے ہوئے زمین پر پڑے تھے۔ غار کے درمیان زوردار آگ بھڑک رہی تھی۔

"ہا ہا ہا،" چڑیل نے بے ہودہ ہنسی نکالی۔ "بے چارے بے وقوف۔"
اژدہے کے منہ سے آگ اور دھواں نکلا۔ "ٹھاہ!" اُس نے اپنی لمبی موٹی دُم دھڑام سے فرش پر ماری۔

"ہم کون اور تم کون؟ کیا تم ابھی تک شک میں ہو کہ ہم تم پر غالب آئیں گے؟"

"کڑک،" اُس نے ایک کوڑا ہَوا میں لہرایا۔ اژدہا چنگھاڑا۔ غار ہل گیا اور دھوئیں سے بھر گیا۔ میرے گھٹنے پگھلنے لگے۔ مَیں نے اپنی لاٹھی اُٹھائی جو مسافر نے مجھے دیا تھا لیکن افسوس، وہ اژدہے کی آگ میں فوراً راکھ ہوگئی۔

"کاؤں کاؤں۔ تلوار کو اُٹھاؤ! تلوار کو استعمال کرو،" انور کی ٹرٹراتی آواز پیچھے سے سنائی دی۔

تلوار کو نکالتے ہوئے مَیں چادر سے اُلجھ گیا اور ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ یہ دیکھ کر بیربل نے لپک کر چادر اُتاری اور تلوار کھینچ کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر اُس نے زور سے اپنا پیالہ چڑیل کے منہ میں پھینک دیا۔ اُس نے ہنس کر اُسے ایک پھونک سے بھسم کر دیا۔

لیکن اُتنے میں مَیں اُٹھ کر اژدہے کا سامنا کرنے میں کامیاب ہوا۔ عین وقت پر مَیں نے تلوار اُٹھائی۔ اژدہا گرجتے ہوئے آگے لپکا، اور اُس کا بھاری جسم مجھ سے ٹکرایا۔ مَیں لڑکھڑایا۔ اژدہے کا بدبودار جسم مجھ پر گر گیا۔

"یہ میرا انجام ہے۔" مَیں نے سوچا، پھر مَیں بے ہوش ہو گیا۔

ایک سودا

نہ جانے مَیں کتنی دیر تک وہاں پڑا رہا۔ جب مَیں نے آنکھیں کھول دیں تو کوّے، بونے اور بیربل کے فکرمند چہرے دھند میں سے جیسے میرے اوپر نمودار ہوئے۔ مَیں اُٹھ بیٹھا اور حیرانی سے اپنا سر کھجلایا۔ چڑیل اور اژدہا کہیں موجود نہیں تھے۔ جہاں پہلے اژدہا تھا وہاں فقط موم کے دو چار قطرے فرش پر پڑے تھے۔ جب میرے ساتھیوں نے دیکھا کہ مَیں ہوش میں آ گیا ہوں تو اُن کے چہرے کِھل اُٹھے۔

"شکر ہے کہ آپ بچ گئے۔"

"چڑیل کہاں ...؟" کمزوری کے باعث میرا گلا بیٹھ گیا۔

وسیم بولا، ”جب اژدہا آپ سے ٹکرایا تو اُس وقت آپ نے تلوار اُس کے جسم میں گھونپ ڈالا۔ تب وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا اور اُس کا جادو ایک دم ٹوٹ گیا۔ چڑیل چیختی چیختی بھاگ گئی۔“

بیربل چھوٹے بچے کی طرح اُچھلتے کودتے چہک اُٹھا، ”بھائی، آپ نے زبردست فتح پائی ہے۔ کیسی بات!“

”اب آرام کریں،“ انور بولا۔

مَیں نے سکون کی سانس لے کر آنکھیں بند کیں اور گہری نیند سو گیا۔

رات وہیں بیت گئی۔ پھر ہم صبح سویرے اُٹھ کر سفر پر روانہ ہوئے۔ اب ہم خوش گوار میدانی علاقے میں سے گزرنے لگے۔ چاروں طرف شاداب گھاس اور قسم قسم کے پھول ہَوا کے ہلکے سے جھونکوں سے لہلہا رہے تھے۔ نشے میں دھت تتلیاں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں۔ شہد کی مکھیاں اپنے چھتوں کے لئے خزانہ جمع کرتے ہوئے گاہے بہ گاہے بھنبھنا

رہی تھیں۔ شبنم کے موٹے موٹے قطرے آفتاب کی کرنیں اِدھر ادھر بکھیر رہے تھے۔

ہم ایک چوراہے پر پہنچے۔ ایک طرف دکان تھی۔ باہر کچھ چیزیں لٹکی ہوئی اور کچھ زمین پر پڑی نظر آئیں۔ تار، زنجیریں، جھاڑو، بالٹیاں، کدال اور بیلچے ایسی چیزیں اشتہار کا کام کرتے ہوئے ہر گزرنے والے کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ ہم بھی اُن کے جادو میں آ کر داخل ہوئے۔

"جی سر۔" ایک چھوٹے قد کا چست و چالاک آدمی پُھرتی سے ہماری طرف لپکا۔ اُس کی چوہے جیسی چھوٹی اور گول آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "آپ کو کیا چاہئے؟ مَیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔" وہ اِدھر اُدھر تیزی سے مختلف قسم کی چیزیں نکالنے لگا۔ "یہ کپڑا اپنی اہلیہ کے لئے خرید لیجئے ... نہیں؟ پھر یہ دیکھو صاحب: یہ عمدہ جوتے خاص کر آپ کے لئے بنائے گئے ہیں۔ لیکن شاید صاحبان کو اوزار کی ضرورت ہو ... یہ صابن سونگھنا۔ کیسی اچھی خوش بو ..." یوں

چوں چوں کرتے ہوئے وہ ہمیں دکان کی ساری اشیا دکھاتا گیا۔ اچانک وہ رک گیا۔

"کیا آپ کے پاس تلوار ہے؟"

بیربل نے احتجاج کیا، "جناب! اُس کی زبردست تلوار ہے۔"

مَیں نے اپنی تلوار دکھائی تو اُس نے اُسے غور سے پرکھا۔ "پرانے طرز کی ہے نا۔ دھار کچھ کند ہے۔ خیر۔"

"یہ لو،" بیربل نے تلوار کو ہَوا میں لہرا کر اور آگے پیچھے لپک کر کسی خیالی دشمن کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ تب اُس کی لمبی پتلی ٹانگیں ایک دوسری کے ساتھ اُلجھ گئیں اور وہ کھڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔

مَیں نے تلوار اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اب تک مَیں نے اِس پر غور نہیں کیا تھا، لیکن سچ مچ وہ کچھ پرانی اور زیادہ استعمال شدہ نظر آئی۔

"میری بات سنو،" سوداگر بولا۔ "آپ مجھے یہ تلوار دیں تو آپ کو نئی بہترین تلوار رعایت پر ملے گی۔ آیئے تشریف لایئے۔" وہ پچھلی دیوار کی طرف اِٹھلاتے ہوئے چلا۔ دیوار سے تلواروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

"کیا آپ نے کبھی ایسی عمدہ اے ون تلواریں دیکھی ہیں؟" موم بتی

کی ٹمٹماتی روشنی میں وہ پُرکشش انداز میں چمک رہی تھیں۔ "یہ لو۔" اُس نے ایک تلوار دیوار سے اُتاری۔ "یہ کیسا شاہکار ہے۔ مضبوط اور تیز دھار۔ کوئی مخالف آپ پر غالب نہیں آئے گا۔ جدید ترین طرز پر بنائی گئی ہے۔"

"سائیں سائیں۔" اُس نے تلوار سے کسی فرضی مخالف کا سر کاٹ ڈالا۔

"ہماری عزت اور شان کے نام،" مَیں نے پھل پر پڑھا۔ "کتنے پیسے لیں گے؟"

"بس فقط پانچ ہزار۔ لیکن اگر آپ مجھے اپنی تلوار دیں تو چار ہزار میں ملے گی۔"

"کاؤں کاؤں۔ اُسے مول مت لینا۔" انور بے قراری سے اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے بولا۔ "بعد میں پچھتائیں گے۔"

لیکن پتا نہیں کیوں، میرا لالچ اِتنا بڑھ گیا کہ مَیں انکار نہ کر سکا۔ اپنی تلوار سوداگر کو دے کر مَیں نے نئی تلوار خرید لی۔

"ٹھہرو،" بیربل پکارا۔ اُس نے ایک چیز کاؤنٹر پر رکھ دی—پانی کی پستول۔

"یہ کیوں خرید رہے ہو؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"پتا نہیں، مجھے پسند آئی ہے،" وہ مسکرایا اور پیسے ادا کئے۔

پھر ہم دکان سے نکل کر آگے بڑھے۔ بیربل معمول کے مطابق اُچھلتا کودتا اپنا نیا کھلونا آزماتا رہا کہ کتنی دور تک پانی پہنچا سکے۔ لیکن دوسرے خوش نہ تھے۔ بونا کچھ زیرِلب بڑبڑاتا رہا جبکہ انور اُداسی کے عالَم میں میرے کندھے پر بیٹھا رہا۔

اب موسم بدل گیا۔ کالے کالے بادل چھا گئے اور بوندا باندی شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ندی نظر آئی۔ اُسے پار کرنے کا پُل قریب ہی تھا۔

"کون؟!" ایک غلیظ آواز گرجی۔ ایک دیو دوسرے کنارے کے پیڑ کے سائے میں سے لپک کر پُل پر آ گیا۔ "دفع ہو جاؤ،" وہ للکارا۔ "تم یہاں سے نہیں گزر سکتے۔"

مَیں اپنی نئی چمک دار تلوار نکال کر آگے بڑھا۔ پیڑ کی لمبی شاخ سے بنا ڈنڈا ہاتھ میں بھالے کی طرح پکڑے دیو میری طرف جھپٹا۔ "مَیں تم سب کو کچا چبا لوں گا!" وہ گرجا۔ پھر نہ معلوم کہ کیا ہوا۔ ہاتھا پائی میں مَیں نے 'چھن' کی آواز سنی اور میری تلوار اُڑ کر ندی میں گر گئی۔

ایک اَور وار

میرے پاؤں دہشت سے جم گئے۔ ”کڑک۔“ دیو کا ڈنڈا میرے کندھے سے ٹکرا گیا۔ مَیں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ درد کی لہر جسم میں سے گزری۔ اب دیو مجھے پکڑنے کو تھا کہ بیربل راستے میں آ گیا۔ اُس نے اپنی پستول کھینچ کر دیو کی آنکھوں میں پانی کا دھارا چلایا۔ دیو کو دھچکا لگا، اور وہ رک گیا۔ ”کاؤں کاؤں۔“ انورکوّا اُڑ کر اُس کے سر کو اپنے پنجوں سے نوچنے لگا۔

”لعنت!“ دیو دہاڑا اور اپنا ڈنڈا ہَوا میں وحشت سے لہرایا۔ تب وہ درد سے چیخ اُٹھا۔ وسیم بونے نے چپکے سے پیچھے سے آ کر اُس کی ٹانگ

میں اپنی چھوٹی مگر تیز تلوار گھونپی تھی۔ انور اُڑ کر بچ گیا اور میرے دوسرے دو ساتھیوں نے بھی بھاگ کر اپنی جان چھڑائی۔ اُن کے حملے سے مجھے بھی بچ نکلنے کا موقع ملا۔

مَیں ڈگمگاتے ہوئے دکان پر واپس پہنچا۔ میری حالت بہت بُری تھی۔ اب تک شدید درد میرے کندھے کو تکلیف دے رہا تھا۔ سوداگر کسی گاہک کے سامنے اپنے سودے کی تعریف کر رہا تھا۔ مَیں سیدھے اُس کے پاس گیا۔

"جی سر، کچھ اَور چاہیئے؟" وہ میری طرف رجوع ہوا۔

"مجھے میری تلوار واپس دینا،" مَیں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بالکل۔" بیربل پکارا۔ "ابھی ابھی اِسے واپس کر دوا"

"کیا؟ اچھا ... یہ تو مشکل ہے،" وہ مسکرایا۔ "وہ تو کسی گاہک کو بہت پسند آئی۔"

یہ سن کر مَیں چکرا گیا۔ "وہ کہاں گیا؟ کون تھا؟" مَیں نے بے چینی سے پوچھا۔

دکان دار لاپروائی سے بولا، ”کیا معلوم؟ مَیں ہر ایک پر دھیان نہیں دیتا جو میرے پاس آتا ہے۔“

مَیں اُداس حالت میں نکلنے کو تھا کہ بیربل بولا، ”ایک بات مجھے عجیب ہی لگتی ہے۔ دکان دار کے وہ لڑکے دیکھو!“

ایک کونے میں دو ملازم کام کر رہے تھے۔ ایک جب جھک گیا تو مَیں چونک پڑا۔ کُرتے کے نیچے ایک کالے زرہ بکتر کی جھلک صاف دکھائی دی۔

دکان دار اب تک گاہک سے گپیں مار رہا تھا۔ ہم چپکے سے واپس مُڑ کر اُس دیوار کے پاس گئے جہاں چمکتی تلواروں کی لمبی قطار لٹکی ہوئی تھی۔ مَیں نے ہر ایک کو دھیان سے دیکھا مگر اپنی تلوار کہیں نہ ملی۔ مَیں مایوس ہو کر چلنے کو تھا کہ بیربل جو کونے میں لٹکی ہوئی تلواروں کو جانچ رہا تھا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ وہ فرش پر بیٹھے اپنے پاؤں کو مَلنے لگا کہ اچانک پکار اُٹھا، ”زبردست! یہ کیا ہے؟“ اُس نے فرش پر پڑے اُن میلے کچیلے چیتھڑوں کی طرف اشارہ کیا جن سے اُس نے ٹھوکر کھایا تھا۔ کوئی چیز اُن میں لپٹی ہوئی چمک رہی تھی۔ مَیں نے لپک کر چیتھڑوں کو

اُتارا تو میری تلوار چمکتی دمکتی نکلی۔ ”راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں،“ مَیں نے زیرِلب پڑھا۔

”ارے، یہ کیا ہے؟“ بیربل بولا۔ چیتھڑوں میں ایک اَور تلوار تھی، بالکل میری جیسی۔ اُس کا جڑواں بھائی۔

”یہ اب تمہاری ہی ہے،“ مَیں نے اُسے اُس کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ پھر ہم دونوں دکان دار کے پاس گئے۔

تلوار کو دیکھ کر دکان دار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ خاموشی سے سکے کاؤنٹر پر پھینک کر ہم دکان سے نکلے۔ دونوں ملازم لپک کر ہمارے پیچھے آن پڑے۔ لیکن ہماری تلواروں کو دیکھ کر وہ رک گئے، پھر دکان دار کے اشارے پر واپس لوٹے۔

”دیکھا آپ نے؟“ بیربل للکارا۔ ”میری پستول کو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔“

”ارے، تم کیسے عجیب بندے ہو۔ وہ تمہاری تلوار سے ڈرتے ہیں۔“

پُل کے قریب کوّا اور بونا ہمارے انتظار میں تھے۔

تلوار کو میرے ہاتھ میں چمکتی دمکتی دیکھ کر وسیم نے کہا، "زبردست! اب ہم ضرور جیت جائیں گے۔"

"دیکھا آپ نے کہ مجھے کیا مل گیا ہے؟" بیربل چہکا۔

دونوں رازدارانہ مسکرائے۔ "یہ تحفہ شہزادے کی طرف سے ہے،" وسیم بولا۔ "اُن کو معلوم تھا کہ آپ کو ضرورت پڑے گی۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ دیو دوبارہ گرجتے ہوئے نکلا۔ لیکن اِس بار مَیں پہلے لپکا۔ "سائیں سائیں۔" تلوار ڈنڈے سے ٹکرائی تو ڈنڈا موم کی طرح کٹ گیا۔ دیو چیخ کر بھاگ گیا، اور ہم پُل کو آرام سے پار کر سکے۔

نادان کسان

”آخر ہماری شہزادے سے ملاقات کب ہو گی؟“ ہم ایک پکے راستے پر چل رہے تھے۔ میرا یہ سوال سن کر وسیم اور انور صرف مسکرائے۔ بیربل کوئی بے تکا سا نغمہ گنگنا رہا تھا۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ بادشاہ کے طور طریقے ہماری سمجھ سے باہر ہیں،“ مَیں پھوٹ پڑا۔ ”تاہم کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نہیں؟“ میرا پھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن میرا دل شہزادے کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

"صبر، یار۔ صبر" وسیم نے ہنسی روک روک کر کہا۔ "فکر مت کرنا۔ مناسب وقت پر تمہاری خواہش ضرور پوری ہو جائے گی۔"

مَیں خاموش ہو گیا لیکن دل کو تسلی نہ ملی۔

"راستہ! ہٹ جاؤ!" ہمارے پیچھے سے آواز آئی۔ ایک کسان دھوتی اور پگڑی پہنے بَیل گاڑی پر سوار تھا۔ بَیلوں کا پُرسکون جوڑا آرام سے اُسے کھینچ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں گُڑگُڑاتا حقہ پکڑے کسان کے نتھنوں سے دھوئیں کے دو سانپ نکل کر کانلی سے اوپر منڈلا رہے تھے۔ پیچھے گندم کی بھاری بوریوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

"کیا گاڑی میں جگہ ہے؟" وسیم پکارا۔

کسان نے جواب میں حقے سے بَیل گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ مَیں اور وسیم چھلانگ لگا کر سامنے بیٹھ گئے جبکہ انور اُڑ کر کسی بوری پر پہرا لگانے لگا۔ بیربل بھی ایک بوری پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک صرف گاڑی کی 'چھن چھن' اور حقے کی گُڑگُڑ کی آواز سنائی دی۔ پھر کسان نے خاموشی کو توڑا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"شہزادے کی تلاش میں ہیں،" مَیں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"وہ تو راہ اور حق اور زندگی ہیں۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟" کسان نے تھتھنے پُھلا کر کہا۔ "راہ؟ یہ میری راہ ہے۔" اُس نے اپنے زوردار بازوؤں کے پٹھے کَس کر فخر سے دکھائے۔ "حق؟ میری دو آنکھیں اور تندرست عقل ہے۔ کسی اَور حق یا سچائی کی کیا ضرورت ہے!" اُس نے اپنے ماتھے پر اُنگلی رکھی۔ "اور جو زندگی کی بات ہے: میرے پیچھے جو کچھ پڑا ہے وہ کافی ہے۔" اُس نے بوریوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہم خاموش رہے۔

مگر بیربل جوش سے بولا، "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واہ جی واہ، کتنے موٹے موٹے پٹھے۔ کیا بات ہے! کسی وقت آپ کا مقابلہ کروں گا۔ ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آپ بیل گاڑی کو سیدھے راستے پر چلا سکتے ہو! بڑی بات ہے۔ اور گندم بھی جمع کیا ہے۔ آپ ہی نے اُسے پالا پوسا ہے۔ مٹی اور پانی الگ۔"

کسان نے اُس پر شک کی نظر ڈالی، مگر بیربل بڑی معصومیت سے گپیں مار رہا تھا۔ کسان خاموشی سے اپنا حقہ پیتا گیا۔ "گُڑ گُڑ، چھن چھن۔"

کچھ دیر کے بعد دو اَور مسافر راستے پر چلتے نظر آئے۔ "اوئے،" ایک نے بَیل گاڑی کو روک دیا۔ "کیا منڈی کی طرف جا رہے ہو؟" کسان نے ہاں میں سر ہلایا۔ "ہمیں بھی لے چلو۔ ہم پیسے بھی دیں گے۔"

"سبھوں کو نہیں بٹھا سکتا،" کسان بڑبڑایا۔

"چلو، ہم اُتریں گے،" وسیم نے جلدی سے کہا۔ کسان نے اعتراض نہ کیا۔ ہم اُتر گئے اور دوسرے ہماری جگہ چڑھ گئے۔

"یہ لوگ بڑے مشکوک ہیں،" وسیم نے کہا جب بَیل گاڑی کھڑکتی کھڑکتی اوجھل ہوگئی۔ "یہ مسافر قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔"

دوپہر کے وقت ہم کھلے میدان کو چھوڑ کر سائے دار جنگل میں داخل ہوئے۔ بانس کے گھنے جھنڈوں نے سورج کی ایک کرن بھی

اندر آنے نہ دی۔ راستہ پُراسرار طریقے سے بل کھاتے ہوئے سرسراتے ہوئے بانس میں سے گزر رہا تھا۔ مَیں کچھ کانپنے لگا۔ خدا جانے کتنے ڈاکو اِس جنگل میں تاک میں بیٹھے ہوں۔

اچانک ہم چونک پڑے۔ راستے کے کنارے سے کچھ دُور کسی کے پاؤں دکھائی دیئے۔ ہم دبے پاؤں اُس طرف بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں: کسان اپنے سر کو کھجلاتے ہوئے زمین پر بیٹھا ہے۔

"ہائے ہائے، کیا ہوا ؟" اُس نے کراہتے ہوئے کہا۔ کچھ کنفیوز لگ رہا تھا۔

وسیم نے جیب سے کُپّی نکال کر کسان کو اُس میں سے چند قطرے پلائے۔ جب دیکھا کہ کوئی زخم نہیں ہے تو وہ دھیرے دھیرے اُٹھا اور اپنی پگڑی ترتیب سے باندھ کر سر پر رکھا۔ پھر ہمیں اپنی رام کہانی سنائی۔ جنگل میں پہنچتے ہی وہ اچانک بے ہوش ہو گیا تھا۔

"کیا مسافروں نے آپ کو کچھ کھلایا پلایا تو نہیں؟" انور نے پوچھا۔

"ہاں ... اُنھوں نے مجھے کچھ شراب پلائی،" اُس نے شرمسار ہو کر کہا۔

"پھر بات صاف ہے۔ اُنہوں نے شراب میں کچھ ڈال دیا ہو گا۔"
بیربل چہک اُٹھا، "آپ کی زندگی کہاں گئی؟"
کسان چونک پڑا۔ چاروں طرف نظریں دوڑا کر چلّایا، "بَیل گاڑی کہاں ہے؟"
وسیم بولا، "اب تلاش کرنے کا کیا فائدہ؟ اُن مسافروں سے پوچھ لو۔ اُن کو ضرور پتا ہو گا۔"
کسان غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ لیکن چیخنے چلانے سے بھی بَیل گاڑی واپس نہیں لائی جا سکتی تھی۔ آخرکار وہ بڑبڑاتے ہوئے ہمارے ساتھ چل دیا۔

دن ڈھلنے کو تھا جب ہم منڈی پر پہنچے۔ دکانوں کے بے شمار چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ کسان ہم سے الگ ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک اِدھر اُدھر منڈی کی چیزیں دیکھتے ہوئے گھومے پھرے۔

"دیکھو، تن درست عقل اُدھر پھر رہی ہے،" وسیم نے مجھے ہلکا سا دھکا دے کر کہا۔

کچھ آگے کسان نشے میں دھت چل رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں کھلی پگڑی لہرا رہی تھی، دوسرے سے وہ بے ہودے سے اشارے کر رہا تھا جبکہ منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

"اوئے، میرے دوستو،" ہمیں پہچان کر وہ ڈگمگاتے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ "ٹھیک ٹھیک ہو؟ ... مَیں آپ کو ایک بڑا راز بتاؤں؟ بڑی حکمت والی بات ہے۔ کسی دکان دار کے پاس میری بوریاں پڑی ہیں۔ اُس نے کہا کہ میری نہیں ... ہا ہا ہا ... کیا خوب نا؟" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے نکلا۔

بیربل نے اُس کے پیچھے پکارا، "مت بھولنا کہ کسی وقت آپ سے کُشتی لڑیں گے۔"

رسوم آباد

منڈی کے قریب ایک کھلی جگہ تھی۔ وہاں ہم چادر بچھا کر رات کے لئے ٹک گئے۔ پھر اگلے دن صبح سویرے اُٹھ کر روانہ ہوئے۔ اب ہر طرف پہاڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ راستہ وادیوں میں سے گزر کر کبھی کھلے میدان کو پار کرتا اور کبھی پھل دار درختوں کے جھنڈوں میں گھس جاتا۔ اُس کے کنارے کنارے ایک ندی سورج کی کرنوں کے ساتھ ناچتی کودتی غرغرا رہی تھی۔ پیڑوں کی ٹہنیوں پر رنگا رنگ پرندے چہچہا رہے تھے۔ اِس انوکھے اور ہرے بھرے ماحول میں ہماری جان میں جان آئی، اور ہماری رفتار دھیرے دھیرے سُست ہوتی گئی۔

دوپہر کے وقت ہمارے سامنے ایک شہر نظر آیا۔ اُس کے بیچ میں ایک اونچا پہاڑ تیز دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ ارد گرد مضبوط اور موٹی موٹی فصیل دشمن کی حوصلہ شکنی کے لئے بنائی گئی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کیا یہ تو بادشاہ کا شہر نہیں ہے؟" مَیں نے سوال کیا۔

کوّے اور بونے دونوں نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "اِس شہر میں ہمیں زیادہ خبردار رہنا ہے،" انور بولا۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "شہر کا نام کیا ہے؟"

"رسوم آباد۔"

ہم داخل ہوئے۔ سڑکیں صاف ستھری تھیں۔ ہر طرف شان دار مکان ہم پر رعب ڈال رہے تھے۔

"ارے، یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟" بیربل چلاّ اُٹھا۔ وہ سونگھ سونگھ کر ساتھ والی ایک چھوٹی سی گلی میں گھس گیا۔ "یہ کیا ماجرا ہے!" وہ پکارا۔ ہم دوڑ کر اُس کے پاس چلے۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ

دیکھو!" ہر طرف کوڑے کچرے کے بڑے بڑے ڈھیر بکھرے پڑے تھے۔ اُن ہی سے بدبُو آ رہی تھی۔

"یہ ہے اِس شہر کی عادت،" انور حقارت سے ٹرّایا۔ "بڑی سڑکیں دکھاوے کے لئے صاف رکھے جاتے ہیں، لیکن اِن سب کے پیچھے کوڑا کچرا پڑا ہی رہتا ہے۔"

"راستہ دو! راستہ دو!" ایک جلوس بڑی دھوم دھام کے ساتھ کہیں سے نکل رہا تھا۔ لوگ عمدہ قسم کے چوغے پہنے بڑے شریف اور دین دار لگ رہے تھے۔ ہاتھوں میں دھواں دان پکڑے وہ کسی اجنبی زبان میں مذہبی گیت گا رہے تھے۔ فضا خوش بودار دھوئیں سے بوجھل تھی۔

بیربل زور سے کھانسنے لگا، "ارے، لوگ دھواں چھوڑ رہے ہیں۔"

ہم جلوس سے جان چھڑانے کے لئے ایک تنگ گلی میں گھس گئے۔ مگر داخل ہوتے ہی مَیں نے ایک لمبی داڑھی والے سے ٹکّر کھائی۔ وہاں سے بھی پروقار جلوس ڈھولک بجاتے بجاتے نکل رہا تھا۔ ہم واپس مڑے تو بیربل بے چارہ سیدھے کیسر یا رنگ کے لباس پہنے ایک مرد سے ٹکرا گیا جس کے پیچھے پجاری تانتا بندھے چل رہے تھے۔ پورا شہر

مسجدوں، مندروں اور گرجوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہر کونے سے گیتوں، نمازوں، اذانوں اور گھنٹیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

جلوسوں سے کتراتے کتراتے ہم ایک کھلے چوک میں پہنچ گئے۔ "حضرات، کان دھروا" ایک لمبی داڑھی والا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کھنکھارا۔ "حضرات، تم سب کو پتا ہے کہ آئین کو ہر طرح سے پورا کرنا ہے، ورنہ جہنم یقینی ہے۔ سو چوری مت کرنا۔ جھوٹ مت بولنا۔ قتل مت کرنا۔ زنا مت کرنا۔ ..." یوں وہ اونچی آواز میں ایک لمبی چوڑی فہرست کی تلاوت کرتا گیا۔

ہم تماشائیوں میں شامل ہوئے اور غور سے سننے لگے۔ اُس کی باتیں معقول اور ضروری لگ رہی تھیں۔ کیا وہ مجھے بادشاہت کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا؟ جب وہ فارغ ہو کر بڑے رعب سے جانے لگا تو مَیں اُس سے ملنے کے لئے آگے لپکا۔ "استاد، کیا آپ مجھے بادشاہت کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟"

بزرگ سنجیدگی سے بولا، "بیٹا، بڑی خوشی کی بات ہے۔ مَیں تم کو ضرور بہت کچھ بتاؤں گا۔ میرے ساتھ آؤ۔" ہم اُن کے پیچھے پیچھے چل کر

ایک ٹیڑھی میڑھی گلی میں پہنچ گئے۔ بزرگ بولا، "ہماری گلی میں صرف پکے پکے دین دار رہتے ہیں۔ اِس میں تم کو کوئی بھی بے دین نہیں ملے گا۔" گلی اِتنی تنگ تھی کہ پورے دن دھندلکا سا چھایا رہتا تھا۔ ہم ایک مکان کے سامنے رک گئے جو زبردست ڈھنگ میں بنایا گیا تھا۔ اُس کی آرائش سنگِ مرمر سے کی گئی تھی۔ شان دار دروازے کے اوپر سنہری حروف میں لکھا تھا، "آئین محل۔" اُسے دیکھتے ہی ہم کافی متاثر ہوئے۔

بیربل حیرانی سے بولا، "کیسی عجیب عمارت ہے! یہ بالکل ٹیڑھی میڑھی ہے۔"

بزرگ نے سونے کی ایک بڑی چابی جیب سے نکال کر دروازے کو کھول دیا۔

ہم ایک تنگ اور اندھیرے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ دیواروں کے ساتھ قدیم اور قیمتی قالین لگے تھے۔ کونے میں ایک بڑی الماری پڑی تھی۔ سجاوٹ کے لئے لکڑی کی تین چھوٹی میزیں، گل دان اور مزید چھوٹی موٹی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

بیربل معمول کے مطابق کمرے میں پھر پھر کر ہر چیز کو پرکھنے لگا۔ پھر چھت کی طرف اشارہ کیا، "استاد، آپ نے بڑے خوب صورت جالے رکھے ہیں۔"

مَیں نے چھت کی سمت دیکھا تو جھٹکا لگا۔ سچ، ہر کونے میں مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے۔

بیربل گپیں مارتے مارتے بولا، "یہ آپ کا قالین بھی کتنا انوکھا ہے۔"

حقیقت میں جس قالین پر ہمیں بٹھایا گیا تھا وہ گھسا پھٹا اور میلا سا تھا۔

بزرگ خفا سے جواب دینے لگا لیکن بیربل کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر اُس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا، "ہمارے نوکر بہت مصروف رہتے ہیں۔ لیکن چنتا مت کرنا، مَیں تم کو سب کچھ سکھاتا ہوں۔"

کہیں سے چائے کے ٹوٹے پھوٹے پیالے اور باسی پرانی روٹی پہنچ آئی۔

"کیا خوب!" بیربل بڑے مزے سے چسکی لیتا اور روٹی کو چپڑ چپڑ کھاتا گیا۔

تب بزرگ نے ایک کتاب احترام سے طاق سے اُتار کر مجھے پیش کی۔ "پہلی بات، پاک نوشتے کو حفظ کرنا ہے۔ اِسے یاد کرو گے تو بادشاہت میں داخل ہونا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

مَیں نے کتاب پر نظر دوڑا کر اُسے پڑھنے کی کوشش کی۔ "مگر یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

بزرگ کچھ جھنجھلا کر بولا، "بے شک تم یہ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تو پاک زبان میں قلم بند ہوا ہے۔ لیکن اِسے پڑھتے جاؤ تو بہت برکت ملے گی۔"

"تو کیا آپ اِسے سمجھ سکتے ہیں؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا۔

"اوپر والے کی یہ باتیں کون پورے طور سے سمجھ سکتا ہے؟ دیکھو، مَیں نے اِسے حفظ کر لیا ہے۔ اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہ کرو۔"

"لیکن اگر آپ اِسے نہیں سمجھ سکتے تو اِس کا کیا فائدہ ہے؟"

بزرگ حاکمانہ بولا، "دیکھو نہ، یہ تو بہت ضروری ہے۔ ورنہ تم کس طرح بادشاہت میں پہنچو گے؟"

بادشاہت کی بات سن کر مَیں نے جوش سے پوچھا، "استاد، کیا آپ گئے ہیں؟ وہ کہاں ہے؟"

اُس نے بات سے کترانا چاہا، مگر مَیں اَڑا رہا۔ تب بولا، "فی الحال مَیں تو یہاں بہت مصروف ہوں۔ جانے کی فرصت نہ ملی۔ لیکن تم نے تو شہر کے بیچ میں پڑے پہاڑ کو دیکھا ہے۔ وہی سب کی منزلِ مقصود ہے۔ ہم تو قریب ہی رہتے ہیں۔ کیا یہ بڑی بات نہیں؟ ہاں، انشا اللہ ہم کسی دن اُس پر جا بسیں گے۔ بے شک، بے شک۔ اِس وقت تو یہاں میرا بہت کام ہے۔ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لانا ہے۔ ہائے ہائے، بہت ہی زیادہ کام ہے۔" اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہائے ہائے،" بیربل نے بھی ٹھنڈی آہ بھری۔ "اِتنا کام کہ آپ خود بھی نہ جا سکے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

بزرگ کے جواب سے مجھے تسلی نہ ہوئی، لیکن مَیں اُسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، اِس لئے مَیں نے عاجزی سے سوال کیا، "استاد، اِس کے علاوہ مجھے کیا کرنا ہے تاکہ بادشاہت کے لئے تیار ہو جاؤں؟"

وہ کچھ دیر اپنی داڑھی تھپتھپاتا رہا، تب بیربل نے اُس کی داڑھی پکڑ کر پوچھا، "میرے چچا رامن نے ایک بار بھی اِس طرح کی داڑھی رکھی۔

کیا یہ سچ مچ لگی بھی ہے؟ میرے چچا نے کہا کہ کھجلی بہت ہوتی ہے۔ کیا آپ کو بھی کھجلی ہوتی ہے؟"

بزرگ نے جھٹکے سے اپنی داڑھی چھڑائی پھر بولا، "دیکھو، بادشاہت کے شہری کے لئے بہت سارے فرائض بھی ادا کرنے ہیں۔ داڑھی کی صحیح کانٹ چھانٹ، کپڑوں کی ٹھیک ترتیب، حرام چیزوں سے پرہیز، نماز کا صحیح طریقہ، حاجت رفع کرنے کا طرز وغیرہ وغیرہ۔ بہت ساری اَور ایسی باتیں ہیں۔ یہ دیکھو۔" اُس نے مجھے الماری کی طرف اشارہ کیا جو بوسیدہ مٹمیلی کتابوں سے کھچا کھچ بھری پڑی تھی۔ "یہ سب کچھ کرو گے تو بہتر رہے گا۔"

بیربل اُٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ الماری کو کھولا، لیکن ایک دم پیچھے لپکا۔ درجنوں موٹی موٹی کتابیں دھڑام سے فرش پر گر پڑیں۔ دھول کا بادل اُڑ گیا۔ بزرگ کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں۔ وہ اُچھل کر کتابیں دوبارہ الماری میں ٹھونسنے لگا۔

"اب وہ جوالامکھی کی طرح پھٹے گا،" مَیں نے سوچا۔

لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر وہ ملائم انداز میں بولا، "میرا شاگرد بنو تو مَیں آرام سے تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔ تمہیں کھانا پینا بھی ملے گا، ساتھ ساتھ سونے کی جگہ بھی۔"

بزرگ کی باتیں سن سن کر مجھے چکر آنے لگے۔ کیا یہ سب کچھ سچ مچ پورا کرنا تھا تاکہ بادشاہت میں داخل ہو سکوں؟ مَیں نے مایوس آواز میں پوچھا، "استاد، مجھے نہیں لگتا کہ مَیں یہ کر پاؤں گا۔ کیا کوئی بھی یہ تمام ہدایات پوری کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟ یہ ہر ایک کا فرض ہے۔ ورنہ ..."

وہ بات کر ہی رہا تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھل گیا اور ایک آدمی اندر آ گھسا۔ وہ غصے سے لال پیلا تھا۔ "لو، اِدھر ہے حرام زادہ!" وہ چیخا، اور بزرگ پر جھپٹ پڑا۔ "کیا تیرا دماغ خراب ہے؟ اِس بار ہم نے تیرے نوکروں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جب وہ میری دکان میں گھس کر چوری کر رہے تھے۔ اور ایک اَور بات۔ میری گھر والی کہتی ہے کہ تُو آنکھیں مارتا ہے۔ یہ لو اِس کا اجر۔" وہ اُس کے گلے کو گھونٹنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر زور سے لڑنے لگے۔ اُن کے اُلجھے

ہوئے جسم کبھی اِدھر لڑکھڑائے، کبھی اُدھر۔ چونکہ وہ باہر کے دروازے کے سامنے ہی ایک دوسرے کو گھونسے مار رہے تھے اِس لئے ہم ایک دم دوسرے دروازے سے نکلے۔ وہاں سے ایک سیڑھی اوپر والی منزل تک پہنچاتی تھی۔ ہم اندھے دھند اوپر چڑھنے لگے۔ لیکن یہ سیڑھی بڑی عجیب تھی۔ وہ بالکل ٹیڑھی میڑھی تھی، اور مَیں کچھ لڑکھڑاتے ہوئے اوپر پہنچا۔

وہاں کا نظارہ دیکھ کر ہم گھبراہٹ سے رُک گئے۔

بیربل چہچہایا، "کیسی بات! کلاس روم ہال میں آ گئے ہیں!"

ایک بڑے ہال میں سَو کے اوپر بچے لمبی قطاروں میں آلتی پالتی مارے کچھ جپ رہے تھے۔ اُن کی آوازیں ہال میں گونج رہی تھیں۔ ہر ایک کے سامنے پانی کا گلاس اور سوکھی روٹی کا ٹکڑا تھا۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ ہر ایک زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ ہر ایک کچھ دبلا پتلا بلکہ بیمار سا لگ رہا تھا۔

"رکو!" ہمارے پیچھے ایک سپاہی دوڑ کر آیا۔ وہ کالا زرہ بکتر پہنے ہوا تھا۔ ہم لپک کر بچوں کی قطاروں میں سے آگے گزرے۔ دوسری طرف

دروازہ تھا جس سے ایک سیڑھی اُترتی ہوئی نظر آئی۔ جب اُترے تو ایک کچن میں پہنچے۔ ہر طرف گندے برتن، دیگ، پلیٹیں اور گلاس بکھرے پڑے تھے۔ ساتھ ساتھ گلا سڑا کھانا اور باسی روٹی کے ڈھیر۔ "ٹھن ٹھن!" بیربل کسی دیگ سے ٹکرا گیا تو چوہے اور لال بیگوں کے دل برتنوں میں سے بھاگ نکلے۔ کچن سے دروازہ باہر کی طرف آدھا کھلا تھا۔ ہم اُس میں سے نکلے اور اندھے دھند دوڑتے گئے۔

لیکن جب ہم کچھ فاصلے پر رُک گئے اور مَیں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا تو صرف انور اور وسیم تھے۔ بیربل کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"پیچھے رہ گیا ہے!" مَیں چیخا۔ "ہمیں اُسے ہر صورت میں نکلوانا ہے۔ اُس کے بغیر کس طرح آگے نکل سکتے ہیں؟"

ہم دلِ نخواستہ واپس کچن کے دروازے پر پہنچے۔ اب سب کچھ خاموش تھا، لیکن دروازہ بند تھا۔ مَیں نے تلوار کو دروازے میں گھونپا تو وہ مکھن میں چھری جیسی آسانی سے گزر گئی۔ یوں راستہ بنا کر ہم اندر گئے اور دبے پاؤں سیڑھی پر چڑھ کر اوپر پہنچے۔ طالب علموں کی وہی قطاریں نظر آئیں۔ مگر اب کونے میں ہمارے ساتھی کی بشاش شکل زنجیروں میں

بندھی ہوئی نظر آئی۔ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور بڑے جوش سے ایک پہرے دار سے گپیں مار رہا تھا۔ اُس کی تلوار ساتھ ہی کونے میں رکھی گئی تھی، جہاں وہ اندھیرے میں چمک رہی تھی۔

"یہ تو بڑا دل چسپ نظام ہے۔ پڑھنے کا یہ طریقہ مَیں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ بھی مونٹیسوری طریقۂ تعلیم ہے؟ اور یہ کھانا کا انتظام! واہ جی واہ! طالب علم پڑھتے ہوئے کھا پی سکتے ہیں۔ کیا بات ہے۔ تقویت بھی پاتے ہیں اور سیکھتے بھی ہیں۔ وہ کب کے شاہی پہاڑ پر چڑھنے کے قابل ہو گئے ہوں گے۔"

طالب علم اُس کے جادو میں آ کر مزے سے سن رہے تھے۔ پہرے دار نے یہ دیکھ کر کوڑا لہرایا تو وہ پھرتی سے دوبارہ جپنے لگے۔

"زبردست۔" بیربل کی چہچہاہٹ بلند ہوئی۔ "تعلیم دینے کا یہ طریقہ کتنا مؤثر ہے۔ میرے چچا رامن بھی یہی طریقہ پسند کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب مَیں نے ایک بار اُن کا پسندیدہ بسکٹ چوری کیا۔ جب پتا چلا تو اُنہوں نے مجھے اِسی طرح سیدھا کیا۔ 'بیربل،' اُنہوں نے کہا،

'تجھے سزا دے کر مجھے تجھ سے زیادہ دُکھ ہو رہا ہے۔' ہاں، میرے چچا بڑی لگن سے پٹائی کرتے تھے۔"

"پھنس گیا!" کسی نے مجھے پیچھے سے زور سے پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ مَیں درد سے تڑپ اُٹھا۔ میرے اوپر ایک پہرے دار کالا زرہ بکتر پہنے فتح مندی سے للکار رہا تھا۔ "اب ہم تجھے سبق سکھائیں گے۔" اُس کے ہاتھ میں کوڑا لہرا رہا تھا۔ "یہ لے—" لیکن اچانک وہ چیخ اُٹھا۔ کوڑا گر گیا، اور وہ لڑکھڑانے لگا۔ اُس کے پیچھے وسیم کی تلوار کبھی اِدھر کبھی اُدھر چمک رہی تھی۔ پہرے دار اُس کا سامنا کرنے مڑ گیا۔ دوسرا پہرے دار بھی لپک کر مدد کرنے آیا۔ اُتنے میں مَیں سنبھل کر اُٹھا اور اپنی تلوار پکڑ کر تیزی سے بیربل کی زنجیروں کو کاٹ ڈالا۔ وہ اپنے بازوؤں اور پاؤں کو ملتے ملتے اُچھل پڑا۔

لیکن اب پہرے دار کی گرجیں سن کر دو اَور پہرے دار کھٹ کھٹ دوسری سیڑھی سے چڑھ آنے لگے۔ مَیں نے مدد کے لئے چاروں طرف دیکھا۔ تمام طالب علم تماشا کا مزہ لے رہے تھے۔ تب بیربل نے لپک کر اپنی تلوار کو پکڑ لیا اور ہر ایک کی زنجیریں کاٹنے لگا۔ قطاروں کے ساتھ

ساتھ دوڑتے ہوئے چند لمحوں میں سب زنجیریں کٹ گئیں۔ کچھ بچے سُنّ پتھروں کی مانند بیٹھے رہے، مگر زیادہ تر اُچھلتے کودتے پہرے داروں سے اُلجھ گئے۔ پہرے دار زور کے دھکے دے دے کر ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے گئے، لیکن اُتنے میں ہم بچوں کے دھارے میں بہتے ہوئے سیڑھی پر سے اُتر کر باہر نکلے۔ جتنے بچے ہمارے ساتھ نکلے تھے وہ اب کودتے ناچتے گلیوں میں بکھر گئے۔

ہم نے ہانپتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ وسیم بونا کڑواہٹ سے بولا، "یہ ہے اِس شہر کا مرض۔ اُنہوں نے زندگی کے ہر پہلو کے لئے قوانین اور سزائیں مقرر کی ہیں۔ لیکن کیا آپ نے دیکھا اِس کا اثر؟"

"تو یہاں کے لوگ اچھے کیوں نہیں ہوتے؟" مَیں نے مایوسی سے پوچھا۔

"دیکھو،" وسیم نے اشارہ کیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بچہ کسی امیر کی جیب کتر رہا تھا۔ قریب ہی ایک مذہبی راہنما شان دار چوغہ پہنے کسی عورت کو آنکھیں مار رہا تھا۔ ساتھ والی سبزی کی دکان میں دکان دار گاہک کے لئے سیب چن کر دو ایک گلے سڑے دانے ڈال رہا تھا۔

انور تڑایا، "شہر کا ایک چکلا بھی نہیں ہے۔ لیکن گھروں کی حالت دیکھو تو اَور بات ہے۔ پسِ پردہ ہر گناہ سرزد ہوتا ہے۔ اور جیل معصوم شریف لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جبکہ پیسے والوں کی کوئی چنتا نہیں۔ رشوت خوری نے اوپر سے نیچے تک سب میں سرایت کی ہے۔"

"اونچی دکان پھیکا پکوان،" وسیم نے اپنے دوست کی تصدیق کرکے کہا۔ "اِن احکام سے وہ اندر سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ لازم ہے کہ پہلے انسان کا دل بدل جائے۔"

ہم ایک تالاب سے گزرے۔ وہاں ایک نوجوان بچوں کو آگاہ کر رہا تھا، "بچو، اِس جگہ غوطہ مت مارنا۔ یہاں پانی میں بڑا پتھر ہے۔ غوطہ لگاؤ گے تو تمہارا بُرا انجام ہو گا۔"

وسیم بولا، "ذرا رکو۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہو گا۔"

بچے سب کے سب تالاب کے دوسرے کنارے پر جا کر نہانے لگے۔ کچھ دیر بعد نوجوان نے احتیاط سے ایک پاؤں پانی میں ڈال کر

اُس کی گہرائی آزمائی۔ پھر تسلی پا کر اُس نے غوطہ لگایا۔ "ٹھاہ!" وہ پانی کی لہر میں ڈوب گیا۔ خاموشی۔

"اُسے نکلنا چاہیئے،" مَیں فکرمندی سے بولا۔ مگر وہ نہ نکلا۔

بیربل لپک کر کنارے پر پہنچا اور پکارا، "مَیں اُسے دیکھ سکتا ہوں۔ وہ زخمی لگتا ہے۔" وہ پانی میں کھسک کر اوجھل ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد نوجوان کا بے ہوش جسم پکڑے کنارے پر واپس لوٹ آیا۔ ہم نے لڑکے کو کنارے پر لٹا کر جو کر سکے کیا۔ اُس کے سر پر بڑا زخم تھا جہاں وہ پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی آنکھیں کھل گئیں، اور اُس نے کمزور آواز میں پوچھا، "مَیں کہاں ہوں؟"

بیربل بولا، "شکر ہے تم بچ گئے ہو۔ اگر تم سونا چاہو تو اپنے ہی گھر میں سویا کرو۔ تالاب میں گزارہ مشکل ہی ہے۔ میرے چچا رامن کہا کرتے تھے، 'بیربل، پہلا اصول: اپنی ہی چارپائی پر سونا۔ ایک بار مَیں شراب پی کر نشے میں آیا تو پوری کی پوری رات نالی میں بیت گئی۔ یقین مانو، مزہ نہ آیا، بالکل نہیں۔ چچی کا قہر الگ'۔"

لڑکے کے دوست دوڑ کر آئے تو ہم اُسے اُن کے حوالے کر کے آگے نکلے۔

"یاد رکھو،" وسیم بونے نے کہا، "بادشاہ کے صرف دو حکم ہیں: بادشاہ سے اور ایک دوسرے سے محبت رکھنا۔ یہ کافی ہیں بلکہ یہی تو سب سے مشکل ہیں۔ اگر ہم اِن ہی کو پورا کریں تو باقی تمام احکام پورے کریں گے۔ نہ ہم جھوٹ بولیں گے، نہ چوری کریں گے اور نہ ہی زنا کریں گے۔ سوال یہ ہے: ہم اِن دو حکموں کو کس طرح پورا کر سکتے ہیں؟"

اب ہم ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے گھومتے پھرتے بیچ کے پہاڑ کے دامن میں آ پہنچے۔

شاہی پہاڑ

پہاڑ کا دامن ویران و سنسان تھا۔ نہ کوئی انسان نہ حیوان دکھائی دے رہا تھا۔ کسی نے بھی وہاں اپنا ڈیرا نہیں لگایا تھا۔ لگتا تھا کہ لوگ جان بوجھ کر پہاڑ سے کچھ دُور بستے ہیں۔ لیکن قریب ہی برگد کا ایک گھنا درخت تھا جس کے سائے میں نائی کا سامان ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ حجام کرسی بھی پڑی تھی، جبکہ پیڑ کے پیچھے ایک چھوٹا کچا سا حمام کھڑا کیا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک موٹا ہٹا کٹا سا نائی بڑے جوش سے آگے لپکا۔ ایک ہاتھ میں قینچی پکڑے اور دوسرے میں زور سے تولیہ لہراتے ہوئے وہ پکارا، ”حضرات، آئیے، تشریف لائیے!“

مَیں بولا، "معاف کریں، ہمیں ضرورت نہیں۔ ہمیں آگے پہاڑ پر چڑھنا ہے۔"

"سچ!؟" نائی خوش ہو کر چہچہایا۔ "بہت خوب، بہت خوب۔ آج کل کم ہی لوگ اِس طرف آتے ہیں۔ یقین مانو، اکثر لوگ اپنا مذہبی رنگ دکھانے میں خوش رہتے ہیں۔ اُنہیں اَور کوئی فکر نہیں۔ اصلی چیز کو چھوڑ وہ اپنی نقلی چیزوں سے خوش رہتے ہیں۔ اور کیا آپ نے اُن کا چال چلن دیکھا ؟ وہ کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ توبہ توبہ۔" اِتنے جوش سے بات کرتے کرتے نائی کو پسینہ آیا۔ اُس نے ایک بڑا چمکیلا رومال جیب سے نکال کر اپنی پیشانی کو پونچھ لیا۔ "آج کل کوئی بادشاہ کے حضور آنے کی آرزو نہیں رکھتا۔ ہر ایک اپنا اپنا راستہ نکال کر گھومتا پھرتا ہے۔"

بادشاہ کا ذکر سنتے ہی میرا دل اُچھل پڑا۔ "کیا آپ بادشاہ کے حضور پہنچے ہیں؟" مَیں نے سرگرمی سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں؟" وہ لاپروائی سے بولا۔ "کیا آپ نے نہیں دیکھا میرا اشتہار تختہ؟" سچ مچ پیڑ کے تنے کے ساتھ ایک تختہ لگا تھا جس پر لکھا تھا، "شاہی حجام۔"

"کیا آپ بادشاہ کے حجام ہیں؟" مَیں نے حیرانی سے سوال کیا۔

"جی، جی۔ سب کے سب پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے میرے پاس آتے ہیں۔ سب ہی کو ضرورت پڑتی ہے۔"

اب وسیم بولنے نے دخل دیا۔ "چلو، چلئے۔ یہ بکواس کر رہا ہے۔ اُس کی گپیں مت ماننا۔ یہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے،" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

نائی کی سنی اَن سنی کر کے ہم آگے بڑھنے کو تھے کہ اُس نے پھر سے ہمیں روکا۔ "ٹھہرو، صاحبان! اِتنی کیا جلدی ہے؟ کیا آپ اِسی حالت میں بادشاہ کے حضور جانا چاہیں گے؟ کیا آپ نے اپنے آپ کو دیکھا ہے؟" اُس نے کہیں سے ایک بڑا آئینہ لا کر میرے سامنے رکھا۔ مَیں چونک پڑا۔ میری حالت قابلِ رحم تھی۔ کپڑے کیچڑ سے لت پت، بال لمبے اور بے ترتیب، ساتھ ساتھ کچھ دنوں کی داڑھی۔

بیربل بھی مڑ مڑ کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے لگا۔ "بہت اچھا۔ یہ کپڑے مجھے بہت جچتے ہیں،" وہ بولا۔ میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ وہ تو مجھ جیسا میلا کچیلا تھا۔

میری پریشانی کو بھانپ کر نائی مسکرایا۔ "سوچ تو لیں۔ بادشاہ کے حضور جانا ہے تو اِسی حالت میں؟ میری سنو اور پہلے نہا کر شیو کراؤ، بال بنواؤ۔ اُتنے میں ہم حضور کے کپڑے دھلا کر سُکھائیں گے۔ تب ہی بادشاہ سلامت آپ کو ضرور منظور کریں گے۔"

نائی کی بات ٹھیک لگ رہی تھی۔ شاید اگر مَیں صاف ستھرا بادشاہ سلامت کے حضور آؤں تو وہ مجھے قبول کریں۔ مجھے جھجکتے ہوئے دیکھ کر بونا اور کوّا اعتراض کرنے لگے۔ وسیم بولا، "اُس کی بات مت ماننا۔ یہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

لیکن مَیں اَڑا رہا۔ "بھائیو، صاف ستھرا ہونے میں کیا نقصان ہے؟"

"بالکل،" بیربل بولا۔ "صفائی تو نصفِ ایمان ہے۔"

مَیں کرسی پر بیٹھ گیا، جبکہ کوّا اور بونا بڑبڑاتے ہوئے کچھ دُور آرام کرنے گئے۔ بیربل حمام میں گیا۔ لگتا تھا کہ اُسے مزہ آ رہا ہے۔ پانی کے

چھینٹوں کے ساتھ ساتھ اُس کی گنگناتی آواز بلند ہوئی۔ اچانک حمام کی ایک دیوار دھڑام سے گرگئی، اور بیربل کی لمبی دبلی ٹانگ نظر آئی۔ "او، معذرت۔" وہ پکارا۔

نائی نے لپک کر دیوار کو دوبارہ کھڑا کیا۔ پھر کپڑا گلے سے لگا کر میرے بال کاٹنے لگا۔ مَیں نے پوچھا، "یہاں پہاڑ کے دامن میں آبادی نہیں ہے۔ یہ کیوں؟"

نائی نے قینچی کو روک کر کہا، "کیا آپ کو نہیں پتا؟ کسی کو جرأت نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ بادشاہ کے قریب رہنا بڑا مشکل ہے۔ وہ تو جاہ و جلال کا بادشاہ ہے۔ وہ اِتنا اعلیٰ ہے، اِتنا عظیم و بلند، اِتنا پاک و مقدّس۔ مانو وہ آگ برسنے والی جوالامکھی ہے۔ کون اُس کے قریب رہ سکتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر شدید دہشت کی جھلک نظر آئی۔ اُس نے آہستہ اپنی بات جاری رکھی، "ایک بار ایک کھاتے پیتے خاندان نے وہاں اپنا عالی شان مکان بنایا۔ اُس بندے کے دماغ میں فطور تھا۔ اُسے کسی سے ڈر نہیں تھا، کیونکہ وہ کاروبار کی کامیابی کے باعث بے حد پھول گیا تھا۔ وہ بولا کہ مجھے کون

چھیڑے گا۔ لیکن پتا ہے کیا ہوا ؟" نائی کی آواز مزید دھیمی ہوگئی۔ "جس دن خاندان مکان میں شفٹ ہوا زور کی کڑک سنائی دی اور وہ مکان خاندان سمیت راکھ ہوگیا۔" نائی نے آہ بھری، "ہاں، بادشاہ کے جلال کے سامنے انسان نیست و نابود ہو جاتا ہے۔"

یہ باتیں سن کر مجھ پر سخت اُداسی طاری ہوئی۔ "پھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں،" میں بولا۔ "ہم تو آگے جا کر راکھ ہو جائیں گے۔"

حمام کی طرف سے بیربل کی گنگناتی ہوئی آواز بلند ہوئی، "جلال کا بادشاہ ... جلال کا بادشاہ ..."

میری مایوسی بھانپ کر نائی دوبارہ چہچہانے لگا۔ "نہیں نہیں، آپ تو فرق ہیں۔ آپ نیک نیت ہیں، آپ پاک صاف ہو کر اُس سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید آپ اُس کے حضور آنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"یہ تو کمال ہے،" مَیں نے جھنجھلا کر کہا۔ "پہلے آپ کہہ رہے تھے کہ مَیں ضرور بادشاہ کے حضور پہنچوں گا، اور اب یہ ناممکن ہی لگ رہا ہے۔ اب صاف بتاؤ۔ کیا مَیں چوٹی تک پہنچ سکتا ہوں؟ اور ہاں، کیا آپ نے نہیں کہا کہ آپ خود بادشاہ کے حضور تک پہنچے ہیں؟"

نائی کو کچھ شرم سی آئی۔ وہ دبی زبان میں بولا، "شاید مَیں کچھ نمک مرچ لگا کر بات کر رہا تھا۔ بے شک مَیں ایک طرح سے ضرور اُن کے حضور آیا ہوں۔ دیکھو، ایک دن ایک بڑا رعب دار رئیس میری دکان پر آیا۔ بولا کہ بادشاہ کی طرف سے ہے۔ پھر پیسے دے کر مجھے کہا کہ ہر ایک کو پہاڑ پر جانے کے لئے تیار کرو۔ دھیان دو کہ ہر ایک صاف ستھری حالت میں آگے چلے۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"سیدھی سی بات یہ ہے،" مَیں بولا۔ "کیا مسافروں میں سے کوئی بادشاہ کے حضور پہنچ گیا ہے؟"

اب نائی کچھ سنبھل کر دوبارہ میرے بال کترنے لگا۔ "دیکھو، بات اِتنی سیدھی سی نہیں ہے۔ سب کچھ بادشاہ سلامت کے ہاتھ میں ہے، اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔ پھر بھی یہ چوٹی بہت ہی اونچی ہے۔ وہ ہم سے دُور ہی رہتا ہے۔ اُس کا جلال تو انسان کو بھسم کرتا ہے۔ وہ بھڑکتی آگ ہے۔ مسافروں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جتنا ہی قریب ہو سکے اُس کے قریب آئیں۔"

مَیں بولا، "لیکن مَیں نے اُس کے شہزادے کا محل دیکھا ہے، جس میں مسافروں کی ضیافت ہو رہی تھی۔ شہزادہ بھی اُس میں شریک تھے۔"

"ضیافت!!؟ شہزادہ!؟ یہ کیسی بکواس ہے؟" نائی پھر کر چیخا۔ اُس کی آنکھیں ناراضی کے مارے چمک اُٹھیں۔ "ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ نہ اُس کا کوئی شہزادہ ہے نہ کوئی ضیافت۔ وہ تو اِن چیزوں سے بلند و برتر ہے۔ ایک بار اوپر نظر ڈالو۔"

اُس نے میری کرسی کو یوں گھمایا کہ مَیں پہاڑ کی چوٹی دیکھ سکوں۔ "سنا آپ نے یہ کڑک کی آوازیں؟ دیکھا آپ نے بادلوں کی چمک دمک اور گرج؟ محسوس کیا آپ نے لرزتی زمین؟"

اب تک مَیں نے یہ کچھ محسوس نہیں کیا تھا، لیکن سچ مچ زمین ہلکی ہلکی ہل رہی تھی۔ اور چوٹی سچ مچ خوف ناک دکھائی دے رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ آپ نے خواب دیکھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ صاف بتاؤں تو بادشاہ سے ڈرنا بلکہ دہشت کھانا ہے۔"

"تو پھر آگے جانے کا کیا فائدہ؟" مَیں نے مایوسی سے کہا۔

نائی جلدی سے بولا، "ایسی کوئی بات نہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ پوری جد و جہد کرے۔ بے شک وہ بادشاہ کے حضور تو نہیں آ سکتا، لیکن وہ دیکھو۔" اُس نے ہاتھ سے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے مجھے صرف دھندلا سا کچھ نظر آیا۔ "یہ لو،" نائی نے میرے ہاتھ میں دُور بین تھما دی۔ اُس کی مدد سے اب مَیں نے کچھ اوپر ڈھلان پر ایک شاداب سبزہ زار دیکھا جس میں پھل دار درخت ہَوا میں جھول رہے اور تازے تازے چشمے اُبل رہے تھے۔ رنگا رنگ مور پنکھ پھیلا کر ناچ رہے تھے۔ غرض یہ جگہ نہایت پیاری لگ رہی تھی۔ لیکن ایک بات تو کچھ کھٹکتی تھی۔

"اُس میں لوگ کیوں نہیں دِکھتے؟" مَیں نے پوچھا۔

نائی شیونگ کریم چھوٹے باؤل میں گھما گھما کر میرے چہرے پر لگانے میں جُٹ گیا تھا۔ تب بولا، "یہ مرغ زار تیار تو کیا گیا ہے۔ بس تھوڑی دیر بعد مقررہ وقت پر لائق مسافر اُس میں جا بسیں گے۔ وہاں تو ہر سہولت ہو گی، ہر آسائش۔ یہی آپ کی منزلِ مقصود ہے، خود بادشاہ کے حضور پہنچنا تو ممکن ہی نہیں۔"

نائی شیو کرتا گیا اور مَیں سبزہ زار کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ جگہ تو بے شک خوب صورت اور اچھی لگ رہی تھی۔ تو بھی اندر ہی اندر میرا دکھ بڑھتا گیا۔ کوئی قربت نہیں؟ کوئی شہزادہ نہیں؟ اِن چیزوں کے بغیر سب کچھ خالی سا لگ رہا تھا۔ مَیں بولا، "تو اُس میں کون داخل ہو سکتا ہے؟"

نائی کچھ دیر خیالوں میں مگن سا رہا، پھر بولا، "دیکھو، اِس میں بھی بادشاہ کا ایک راز ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگ اُسی کی مرضی سے داخل ہوتے ہیں۔ بلکہ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زیادہ راست باز آدمی کو رد کیا جائے جبکہ ڈاکو اور دغاباز کو اُس میں رہنے کی جگہ ملے۔"

مَیں نے جھنجھلا کر کہا، "یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر بادشاہ عادل اور راست باز ہے تو یہ کس طرح اُس کی مرضی ہوسکتی ہے؟ اگر یہ باغ چوروں، زناکاروں، دغابازوں اور قاتلوں سے بھرا پڑا ہو تو اُس میں داخل ہونے کا کیا فائدہ ہے؟ اور ویسے، مجھے کس طرح یقین ہے کہ وہاں تک پہنچوں گا؟"

نائی نے سرد آہ بھری۔ ”بادشاہ کے طریقے اور ارادے ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ وہ جو گرجتے بادلوں میں رہتا ہے سب کچھ کنٹرول کرتا ہے۔ اُس کی مرضی کو تسلیم کرنا ہی ہے اور بس۔“

یہ سن کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ ”مطلب ہے کہ نہ مَیں بادشاہ کے حضور آسکتا ہوں، نہ ہی کوئی یقین ہے کہ اُس باغ تک پہنچوں گا۔“

نائی نے حامی بھر کر سر ہلایا۔ ”لیکن فکر مت کرنا۔ امید ہے کہ آپ پہنچیں گے ... انشا اللہ۔ پتھر کی تختیاں تو آپ کے پاس ہوں گی۔“

”پتھر کی تختیاں؟ یہ کیا ہیں؟“

”اچھا، آپ کو نہیں معلوم؟ پتھر کی تختیوں کے بغیر بادشاہ سلامت کے باغ میں پہنچنا سخت منع ہے۔“

”لیکن یہ تختیاں کہاں سے ملتی ہیں؟“ مَیں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اگر آپ کے پاس نہ ہوں تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس ایک فالتو سیٹ ہے۔ بعد میں آپ کو دوں گا۔“

یوں گپیں مارتے ہوئے اُس نے میرے بال کاٹ کاٹ کر اور داڑھی کو مونڈ مونڈ کر مجھے فارغ کر دیا۔

اُتنے میں بیربل حمام سے نکل آیا تھا، اور مَیں حمام میں جا کر نہایا۔ جب صاف ستھرا نکلا تو کپڑے بھی سوکھ گئے تھے۔ بیربل نائی کی پرانی شلوار پہنے شیو کروانے سے فارغ ہو رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے دوربین سے پہاڑ کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ باغ تو کچھ بھی نہیں ہے!" اُس نے قرار دیا۔

"اُس کے پیچھے بہت کچھ نظر نہیں آتا،" نائی نے جواب دیا۔ تب مجھے دیکھ کر بولا، "یہ لو۔" اُس نے میرے ہاتھ میں پشتی تھیلا تھما دیا۔

"اُف! یہ تو حد سے زیادہ بھاری ہے،" مَیں نے کہا اور اُسے مشکل سے اُٹھا کر پشت سے باندھا۔

"بے شک۔ لیکن اِس کے بغیر گزارہ مشکل ہی ہے۔" نائی نے جواب دیا۔

مَیں نے سوال کیا، "اِن پر کیا لکھا ہے؟"

"یہ تو بادشاہ کا قانون ہے۔" اُس نے ایک تختی نکال کر اونچی آواز میں پڑھا، "چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا، جھوٹی گواہی نہ دینا، ماں باپ کی عزت کرنا۔" پھر اُسے واپس تھیلے میں ڈال کر بولا، "اِس طرح کی

بہت سی باتیں درج ہیں۔ بیچ میں وقت نکال کر اِس کو پڑھنا اور یاد کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ صرف قانون کی بنیاد پر ہی باغ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ لیکن فکر مت کرنا۔ اب آپ صاف ستھرے ہیں، اور آپ کے پاس قانون کی تختیاں بھی ہیں۔ کیا یہ دیکھ کر بادشاہ سلامت آپ کو منظور نہیں کریں گے؟ ... انشا اللہ۔"

نائی نے بیربل کو بھی پشتی تھیلا پیش کیا، لیکن اُس نے چٹ سے انکار کیا۔ "شکریہ، مجھے نہیں چاہیئے۔ مجھے پہلے سے بُرا تجربہ ہوا ہے۔ جو کنستر مَیں ریگستان میں اُٹھائے پھرا وہ کافی تھا۔"

نائی نے بہت زور دیا، لیکن وہ اَڑا رہا۔

مَیں نے پوچھا، "تو جن کو رد کیئے گئے ہیں اُن کا کیا انجام ہو گا؟"

نائی جھجکا پھر دبی آواز میں بولا، "وہ مردود اور لعنتی ہیں۔ جس جگہ اُنہیں دھکیل کر پھینکا جائے گا اُس کے بارے میں آپ جاننا نہیں چاہیں گے۔"

ایک کالا بادل سورج پر سے گزرا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی مدھم سی ہوگئی۔ مجھ پر کپکپی طاری ہوئی۔ پھر اپنے آپ پر قابو پا کر بولا، "چلو،

پھر چلتے ہیں۔" مَیں پیسے نائی کے ہاتھ میں تھما کر اپنے ہم سفروں کے ساتھ روانہ ہوا۔ وسیم اور انور خاموش رہے، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش نہیں ہیں۔

اب چلنا مشکل ہو گیا تھا، کیونکہ پتھر کی بھاری تختیاں مجھے دبا رہی تھیں۔ راستہ چڑھنے لگا۔ میری رفتار آہستہ ہوئی، اور مَیں رک رک کر چڑھنے لگا۔

"کم سے کم اِن تختیوں کو تو چھوڑ دو،" وسیم نے مجھے منوانے کی کوشش کی۔

مَیں نے اعتراض کیا، "ہرگز نہیں۔ یہ بہت ضروری ہیں۔ کیا آپ نے نائی کی بات نہیں سنی؟"

کوّا اور بونا چپ رہے۔

میری سانس خوب پھولنے لگی۔ شروع میں ہلکی ہلکی چڑھائی تھی، لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھے چڑھنا نہایت کٹھن ہوتی گئی۔ مَیں نے رشک بھری نظر بیربل پر ڈالی جو چھوٹے بچے کی طرح اُچھلتے کودتے

کبھی اِدھر کوئی پتھر اُٹھا کر جانچتا، کبھی اُدھر درخت کے کسی پھل کو چن کر دیکھتا۔ ساتھ ساتھ گپیں ہانکتا رہتا۔

سورج جلد ہی ڈھلنے والا تھا، اور اب تک پہاڑ کی چوٹی اُتنی ہی اونچی اور دُور لگ رہی تھی۔ راستہ بھی صرف برائے نام نکلا بلکہ اب جھاڑیوں میں سے گزرنا پڑا۔ کانٹے دار پودے بدن کو چبھوتے رہے، اور چہرے، بازوؤں اور ٹانگوں سے خون رسنے لگا۔

"کاؤں، آگے دھواں ہے،" انور بولا۔

بزرگ کی ہدایت

اور سچ، کچھ دیر کے بعد ہم ایک پیڑ کے پاس رکے جس کے سامنے ایک بزرگ آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی سفید داڑھی سورج کی آخری کرنوں میں چمک رہی تھی۔ آگ پر سادہ سا کھانا پک رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”خوش آمدید، خوش آمدید۔ کہاں جا رہے ہو؟“

”ہم پہاڑ کے باغ میں جانا چاہتے ہیں،“ بیربل چہچہایا۔

”اچھا؟ کیسی بات!“ وہ کِھل کر ہنس پڑا۔

”کیوں؟ کیا یہ مذاق والی کوئی بات ہے؟“ مَیں بپھر کر بولا۔

بزرگ نے جواب نہ دیا بلکہ بولا، "تھوڑا آگے جا کر تم کو پتا چلے گی بات۔ واپسی پر میرے پاس رکنا۔"

اُس کی بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ہم نے سفر جاری رکھا۔ اب تختیوں کا بوجھ اُٹھانا برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ پھر بھی میرے اندر اِتنی شدید آرزو تھی کہ مَیں لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ میرے صاف ستھرے کپڑے پسینے سے شرابور اور کانٹوں سے گھستے پھٹتے جا رہے تھے۔ میرے سنورے بال بکھر کر گرد سے میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ تنکے اور پتے اِدھر اُدھر اُن میں اُلجھ گئے تھے۔

کچھ آگے جا کر بھڑکتی آگ دُور سے نظر آئی۔ میرے قدم کچھ تیز ہوئے، اور ہم جلدی جلدی ایک عجیب سے نظارے کے پاس پہنچے۔ ہمارے راستے میں ایک وسیع اور گہرا گڑھا تھا، جس میں گرم لاوا اُبل رہا تھا۔ جگہ جگہ بھڑکتے لاوا کے فوارے پھوٹ نکل رہے تھے۔ پار کرنے کا راستہ تھا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر ہم اُس کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔ لیکن بے فائدہ۔ ہاں، ایک جگہ ایک پُل تھا، لیکن وہ تار جیسا چوڑا تھا۔ پھر بھی مَیں نے اُس پر پاؤں رکھا بلکہ دو ایک قدم اُس پر چلنے

کی کوشش بھی کی۔ لیکن تار زور سے ہلنے لگا، اور مَیں ڈر کر پھرتی سے واپس کنارے پر آ گیا۔ ”اِس پر سے گزرنے کی کوشش کروں گا تو یقیناً گڑھے میں گر جاؤں گا،“ مَیں نے آہ بھر کر کہا۔

بیربل لاوا کو دیکھ کر دور ہی رہا۔ انور اور وسیم چپ رہے، لیکن اُن کے چہروں کے انداز سے پتا چلا کہ اُنہیں یہ کچھ پہلے سے معلوم تھا۔

آخر میں ہم مایوس ہو کر مڑے اور دوبارہ بزرگ کے پاس پہنچے۔ کھانا تیار ہو چکا تھا، اور اُس نے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ ہم خوشی سے یہ قبول کر کے بیٹھ گئے۔ جنگل کی جڑی بوٹیوں سے بنا یہ کھانا سادہ اور پھیکا تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔

کھانا کھاتے وقت میری نظر بار بار بزرگ پر پڑی۔ آخر میں بات میرے منہ سے پھوٹ نکلی، ”استاد، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ دوسرے سب مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں لیکن آپ یہاں ٹک کر رہ گئے ہیں۔“

بزرگ کچھ دیر خیالوں میں مگن رہا، پھر بات کرنے لگا، ”جب مَیں جوان تھا تو مَیں بھی تم لوگوں کی طرح بادشاہ کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

مَیں بھی یہاں تک پہنچ کر مایوس ہو گیا۔" اُس نے سرد آہ بھری، اور یادوں میں غرق خاموش ہو گیا۔ پھر بولا، "نہ بادشاہ کے حضور پہنچنا ممکن لگتا تھا اور نہ ہی اُس کے باغ کے پاس۔ اور یہ بھاری تختیاں— کون اِن کو اُٹھا کر ساتھ لے جا سکتا ہے؟ کیا تم نے دیکھا وہ گڑھے کا پُل؟ اُسے پار کرنا پہلے سے مشکل ہے تو تختیوں کے ساتھ ناممکن ہی ہے۔ نہیں بیٹا، یہ طریقہ سراسر غلط ہے، یہ کبھی تمہیں آگے نہیں پہنچا سکتا۔ دوسرے، اِس کا فائدہ کیا ہے؟ کیا اِس سے تم شاہی قانون پر چلو گے؟ ہرگز نہیں! کیا تم نے شہر میں لوگوں کی حالت نہیں دیکھی؟ اور جو یہ تختیاں اپنے پاس رکھتے وہ بھی اُن کی ہدایات پر نہیں چلتے۔ کیوں؟ اِس کا سیدھا سا جواب ہے۔ یہ تختیاں اُن کے دلوں میں نقش نہیں ہوئیں۔ وہ بیرونی اور دل سے الگ رہے ہیں۔"

مَیں بولا، "اُستاد، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ تختیاں بہت بھاری ہیں، اور پھر بھی دل پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن اِس کا کیا حل ہے؟"

بزرگ نے جواب دیا، "تم خود اُن کی تلاوت کرو۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن پرغور و خوض کرو۔ اُن کو دہراتے ہوئے بادشاہ کی پُرجلال اورعظیم ذات میں مگن ہو جاؤ۔"

"ہاں، ہاں، یہ ٹھیک ہی ہے،" بیربل نے اُچھل کر کہا۔ اُس کے مایوس چہرے میں جوش آ گیا۔

میرا حوصلہ کچھ بڑھنے لگا۔ "لیکن اِس کا کیا طریقہ اپناؤں؟ مَیں کس طرح اِس میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟"

بزرگ نرمی سے مسکرایا۔ "پہلا اصول: دنیا کو ترک کرنا۔ بہت ضروری ہے کہ دنیا کے شور شرابے سے دُور رہنا تاکہ اندرونی باتوں تک پہنچ سکو۔ یہ اِس میں تمہاری مدد کرے گی۔" اُس نے میرے ہاتھ میں ایک کتاب تھما دی۔ "اِس کو پڑھو۔ اِس میں سب کچھ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہو تو بہتر رہے گا۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے—غم کے نہیں بلکہ خوشی اور شکرگزاری کے۔ کچھ لمحے پہلے دنیا اندھیری اور دُکھی نظر آ رہی تھی، لیکن اب اِس اندھیرے میں اُمید کی روشن کرن پڑ گئی۔ ایک نئی دنیا میری

آنکھوں کے سامنے کھل گئی۔ "بہت، بہت شکریہ۔ کیا آپ میری ہدایت کرتے رہیں گے؟"

بزرگ نرمی سے بولا، "بیٹا، مَیں خود متلاشی ہوں۔ مَیں خود بھی گڑھے کو پار کرنے کی کوشش میں لگا ہوں۔ مَیں نے بہت محنت مشقت تو کی ہے، بہت پھیرے لگائے ہیں، سالوں سے ذکر کرتا آیا ہوں۔ مگر بے فائدہ۔ اور یہ کیوں؟ مَیں اِس نتیجے تک پہنچ گیا ہوں کہ مجھے ایک مرشد کی اشد ضرورت ہے۔

"مرشد؟" بیربل نے اچنبھے میں آ کر پوچھا۔ "مطلب ہے کوئی راہنما؟"

"ہاں، ایک راہنما، ایک ہادی جس کے ذریعے ہم بادشاہ کے حضور پہنچیں۔ اب مَیں اُسی کی تلاش میں ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہی کرو۔"

بیربل بولا، "ٹھیک، ٹھیک۔ مَیں روحانی محنت مشقت کروں۔ بالکل درست۔ پھر بھی مرشد کے بغیر نجات ناممکن۔ کیسی بات ہے۔"

بزرگ کی اِن باتوں نے میری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پھر بھی آگے کا راستہ کچھ نہ کچھ صاف تھا۔ کھانے کے بعد بزرگ نے ہمیں ذکر اور ورد کے بارے میں بہت کچھ سکھایا۔ رات گئے ہم دونوں سو گئے۔ بونا اور کوّا پہلے سے سوئے ہوئے تھے۔

صبح سویرے ہم الوداع کرکے روانہ ہوئے۔ اب کون سا راستہ اختیار کرنا تھا؟ دل نہیں کرتا تھا کہ دوبارہ اُتر کر آبادی میں جائے۔ مَیں کسی پُرسکون جگہ میں اپنا نیا خزانہ پڑھنا اور ذکر کے طریقے عمل میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہم دوبارہ گڑھے کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا اُبلتا چشمہ اور دو چار پیڑ نظر آئے۔ مَیں ایک کے سائے میں بیٹھ کر ذکرِ بادشاہ میں مگن ہو گیا۔ مَیں خیالوں میں کھو گیا۔ میری اندرونی آنکھوں کے سامنے بادشاہ کا دہشت ناک جلال زور سے اُبھر آیا۔

بیربل بھی ساتھ والے درخت کے سائے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ تیوری چڑھا کر ذکر میں غرق ہوا۔ اُس کا گنجا سر چاند کی طرح اُس کے لمبی دبلی ٹانگوں کے اوپر چمک دمک رہا تھا۔

میرے ساتھی ہم سے مایوس ہو گئے تھے۔ وسیم بونا آگ لگانے کی لکڑی چننے کے لئے ارد گرد کے جھنڈوں میں پھرنے لگا جبکہ انور کوّا پیڑ میں اُڑ کر اونگھنے لگا۔

دو ایک گھنٹے کے بعد بیربل اُکتا گیا۔ "یہ میرے بس کی بات نہیں،" وہ اُٹھا اور ارد گرد ٹہلنے لگا۔

مَیں کتاب کو کھول کر پڑھنے لگا۔ اُس میں بادشاہ کی صفات کی لمبی سی فہرست درج تھی۔ مَیں ہر ایک صفت کو دہراتے ہوئے خیالوں میں ڈوب گیا۔

تب بیربل کی چہکتی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔ بزرگ بیربل کو ساتھ لے کر میرے پاس پہنچا۔

مَیں احترام سے اُچھل پڑا۔ "استاد، آپ کیوں تشریف لائے ہیں؟"

"یہ لڑکا میرے پاس آ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ گپیں ہانکتے ہوئے میری جان نہیں چھوڑتا۔"

"مَیں اُستاد کو اپنے چچا رامن کے بارے میں بتا رہا تھا،" بیربل نے وضاحت کی۔

"نہ مَیں رامن نہ جامن کے بارے میں سننا چاہتا ہوں،" بزرگ بڑبڑایا۔ "میرا وقت قیمتی ہے۔ مہربانی کرکے مجھے اِس بَلا سے دُور رکھو!" وہ جھینکتے ہوئے واپس چلا گیا۔

تب بیربل وسیم کے ساتھ مل کرلکڑی چننے لگا۔

مَیں دوبارہ صفات کا ذکرکرنے میں جٹ گیا۔ ہر ایک صفت میری اندرونی آنکھ سے گزرتی گئی، اور مَیں اُس پر دھیان دے دے کر اُسے دہراتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں، مجھے سکون نہیں مل رہا تھا۔ اِس کے برعکس جتنا ہی مَیں یہ صفات جپتا گیا اُتنا ہی میری گھبراہٹ اور بے چینی بڑھتی گئی۔ رفتہ رفتہ سخت دہشت اورخوف مجھ پر طاری ہوا۔ اور جب بھی مَیں اِن سے بچنے کی کوشش کرتا تو گڑھے کی طرف سے عجیب و غریب گھوں گھوں اورسی سی مجھے بادشاہ کے جلال کی یاد دلاتی۔ زمین کا ٹھرٹھرانا اِس میں اضافہ کرتا۔ مجھے چکر آنے لگے۔ یوں لگا جیسے کوئی میرے گلے کو گھونٹ رہا ہو۔ وحشی احساسات میرے دل کو جھنجھوڑنے

لگے۔ تب ایک دھیمی آواز میرے اندر ابھر کر مجھے ملامت کرنے لگی، "تُو نکمّا ہے، تُو کبھی بادشاہ کے قریب نہیں پہنچے گا۔ دیکھ تو صحیح اپنی بگڑی حالت۔" اور یہ آواز بڑھتی بڑھتی میرے اندر زور سے گونجنے لگی۔

مَیں اُچھل کر زور سے چیخا اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ ایک ہی خیال سر پر سوار تھا، یہ کہ کسی نہ کسی طرح اِن حول ناک آوازوں اور جذبات سے سکون پاؤں۔ وسیم بونا اور انور کوّے کی پکاریں میرے پیچھے بلند ہوئیں لیکن مَیں نے پروا نہ کی۔ مَیں دھندلے پن میں پہاڑ سے اُترتے اُترتے نائی کی دکان سے گزرا۔ شہر کی ٹمٹماتی روشنیاں میرے سامنے نظر آئیں۔ مَیں دیوانے کی طرح جھپٹ کر اُس کی گلیوں میں گھس گیا۔ تب کچھ سنبھل کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے مَیں ایک چوک میں بیٹھ گیا۔ اب تک بازار میں گہما گہمی تھی۔ لوگ اپنا دل بہلانے اور دکانوں میں سودا خریدنے کے لئے گھوم رہے تھے۔ اُن کا اطمینان دیکھ کر مَیں نے سوچا، "اب سے پہاڑ اور بادشاہ کی تلاش سے دُور رہوں گا۔ یا تو سب راستے آخر میں بادشاہ تک پہنچتے ہیں یا یہ ساری جد و جہد بے سود ہے۔ بہتر ہے کہ کچھ دُور رہ کر ٹک جاؤں۔ نیک کام کروں اور یہ باتیں بھول جاؤں۔ جو بھی ہو سو ہو۔ تمام

دن دُکھ اور رنجیدگی سے بھرے رہتے ہیں۔ سب کچھ باطل ہی ہے۔ انسان کے لئے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کھائے پیئے اور اپنی محنت مشقت کے پھل سے لطف اُٹھائے۔" تب مَیں تھک کر سو گیا۔

ایک انوکھا خواب

سوتے سوتے میرے مضطرب ذہن میں عجیب و غریب تصویریں اُبھرنے لگیں۔ چچا کی ڈراؤنی موت۔ امی کی سخت بیماری۔ سکول میں دوسرے بچوں کی ٹھٹھابازی۔ اُستاد کی مار پیٹ۔ جوانی کا اُتار چڑھاؤ۔ اپنی سخت بیماری۔ یہ کچھ خواب میں دیکھتے دیکھتے میری پریشانی بڑھتی گئی۔ کبھی مَیں کسی اونچے پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے پہنچنے والا ہوتا کہ اچانک ہی پھسلتے پھسلتے دامن میں گر پڑتا۔ کبھی کلاس روم میں کوئی اُلجھا ہوا ریاضی مسئلہ حل کرتے کرتے تھک جاتا۔ کبھی دریا میں تیرتے تیرتے دوسرے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرتا، لیکن بے فائدہ۔

اچانک خواب کا رخ بدل گیا۔

ایک عظیم ہستی جھیل کے کنارے کنارے چل رہی ہے۔ کچھ جال بچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دو چار مرد اُن کی مرمت کر رہے ہیں۔ تب یہ ہستی اُن کو بلاتی ہے، اور وہ فوراً اُن کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

پھر وہی ہستی۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں سے گھری ہوئی۔ سب بے چینی سے اُن کی باتیں سن رہے ہیں۔ عجیب عجیب قسم کے لوگ اُن کے حضور لائے جا رہے ہیں۔ لنگڑے جو قریب آ کر اُچھل پڑتے اور چلتے کودتے چلے جاتے۔ مریض جو ایک دم شفا پا کر اپنی چٹائیوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ اندھے جو ٹٹول ٹٹول کر پاس آ کر بینا ہو جاتے ہیں۔

کھانے پینے کی جو تھوڑی بہت چیزیں لوگ اپنے ساتھ لائے ہیں وہ ختم ہو گئی ہیں۔ لیکن کوئی بھی جانے کا قدم نہیں اُٹھاتا۔ بال بچے نڈھال ہو رہے ہیں، لیکن کوئی بھی وقت کا لحاظ نہیں کرتا۔ تمام نگاہیں اُس ہستی پر لگی ہوئی ہیں۔ بھیڑ نے تین دن سے اُنہیں یوں گھیرے رکھا ہے۔ اُن میں کیا جادو ہے؟

تب وہ کہیں سے دو چار روٹیاں اور مچھلیاں لے کر اُنہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ روٹیاں اور مچھلیاں کم نہیں ہو رہیں۔ ٹکڑوں کا ڈھیر ہو گیا ہے، اور مزید ٹکڑے بنتے جا رہے ہیں۔ تب اُن کے ساتھی یہ ٹکڑے ٹوکروں میں ڈال کر بانٹنے لگتے۔ پہلا ٹوکرا، دوسرا ٹوکرا، تیسرا ٹوکرا، ہاں بہت سارے ٹوکرے بھر جاتے۔ سب کے سب پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔

اب وہ اپنے قریبی ساتھیوں کو ایک کشتی پر بٹھا کر جانے کا اشارہ دیتے ہیں۔ خود وہ پیچھے رہ کر اکیلے ایک پہاڑ پر چڑھ جاتے ہیں۔ وہاں وہ دعا میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن ایسی گہری اور پُرخلوص دعا مَیں نے کبھی نہیں سنی۔ اب سورج ڈوب گیا ہے، اور اندھیرے میں وہ جھیل کے کنارے پر لوٹ آتے ہیں۔ اُن کے ساتھی اب کھیتے کھیتے جھیل کے بیچوں بیچ پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ سخت ڈرے ہوئے ہیں۔ طوفانی ہَوا چل رہی ہے، اور کشتی پہاڑوں جیسی لہروں سے ٹکراتے ٹکراتے ڈوبنے کے خطرے میں ہے۔

اب یہ ہستی پانی پر قدم رکھ کر اُس پر چل پڑتی ہے۔ یوں ہی جیسا کہ زمین پر۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے کشتی کے قریب آتی۔ کشتی کے سواری اُن کو دیکھ کر ڈر کے مارے چیخ اُٹھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھوت پریت اُن پر چڑھ آیا ہے۔ لیکن وہ آواز دے کر اُنہیں تسلی دیتے ہیں۔ تب ایک ہٹا کٹا ساتھی دلیری سے کشتی پر سے اُتر کر اُن کی طرف چلنے لگتا ہے۔ لیکن اچانک وہ گھبرا جاتا، پھر چیختے چلاتے پانی میں دھنسنے لگتا ہے۔

اُسی لمحے یہ ہستی ڈوبنے والے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے واپس کشتی پر لے جاتی ہے۔ اچانک وہ میری طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتی ہے۔ مَیں سخت گھبرا جاتا ہوں۔ وہی محبت بھری ہستی ہے جو مَیں نے پہلے خواب میں کھمبے پر لٹکی ہوئی دیکھی تھی۔ وہی شہزادہ جسے مَیں نے محل میں دیکھا تھا۔ "وہ مجھے بلا رہے ہیں!" یہ سوچ کر مَیں خواب میں اُن کی طرف چل دیتا ہوں۔ لیکن افسوس، جتنا مَیں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اُتنا ہی وہ مجھ سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ اوجھل ہو جاتے ہیں۔

خواب کا رخ دوبارہ بدل گیا۔

اب مَیں چیل کی طرح ہَواؤں میں منڈلاتے ہوئے ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جھپٹ رہا ہوں۔ قریب پہنچ کر وہی ہستی دِکھتی ہے جو مَیں نے پہلے دیکھی ہے۔ اُن کے تین ساتھی ہیں۔ ایک دم اُن کی شکل و صورت بدلنے لگتی ہے۔ بدلتی بدلتی وہ سورج کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ اچانک دو اَور عظیم ہستیاں ظاہر ہو جاتی ہیں جو اُن سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ وہ بھی چمکتے دمکتے ہیں۔

تب ایک بادل چوٹی پر چھا جاتا اور ایک پروقار آواز فرماتی ہے، "یہ میرا پیارا فرزند ہے، جس سے مَیں خوش ہوں۔ اِس کی سنو۔"

مَیں اُس ہستی کے قریب آنا چاہتا ہوں، لیکن میرے پٹھے کام نہیں کر رہے۔ مَیں زور سے پکارنے لگتا، منت کرکے اپنے بازو اُن کی طرف پھیلاتا ہوں۔ لیکن وہ دوبارہ غائب ہونے لگتے ہیں، اور مَیں اکیلا ہی رہ جاتا ہوں۔ مَیں اندھیرے میں ڈوبتا جاتا، ڈوبتا جاتا ہوں۔

چوٹی پر

"منظور، منظور!" کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ مَیں اب تک گہری نیند کی لپیٹ میں پڑا تھا۔ پھر میری آنکھیں دھیرے دھیرے کھل گئیں۔ چوک ویران و سنسان تھا۔ کون مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا ؟ مَیں یہ آواز کہاں سے جانتا تھا ؟

"طارق! آپ!؟؟"

"ہاں، منظور۔ مَیں طارق ہی ہوں۔ آپ کو یقین تو نہیں آ رہا۔" طارق کا فکرمند چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"سو آپ ریگستان میں نہ مرے؟ آپ کس طرح بچ گئے؟"

طارق میرے پاس بیٹھ کر نرمی سے کہنے لگا، "مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے میری جان بچائی تھی، اور پھر بھی مَیں کنستر لے کر بھاگ گیا تھا۔ یہ تو بڑی احمق اور خود غرض حرکت تھی۔ اُس وقت مَیں نے آپ کی محبت کو پاؤں تلے روندا۔ اِس کے لئے مَیں دل سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ ہاں، اِسی لئے مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

"بھیجا گیا؟ کس نے آپ کو بھیج دیا؟"

"میرے آقا، میرے مرشد نے مجھے بھیجا۔"

"مرشد؟ طارق، ہوش میں آؤ! کوئی مرشد نہیں۔ کوئی شہزادہ نہیں، ہاں بادشاہ کا کوئی بھی راستہ نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ مَیں نے ہر طریقہ، ہر راستہ آزمایا ہے۔ میری تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا گیا ہے۔"

طارق نرمی سے مسکرایا اور بولا، "مَیں آپ کے جذبات کو جانتا ہوں۔ مَیں بھی ایسا ہی سوچتا تھا۔ مجھے بھی پکا یقین نہیں آ رہا تھا کہ بادشاہ اور شاہزادہ کیا چیز ہے۔ اِسی لئے مَیں جھجکتا رہا، ہر بات پر شک کرتا رہا۔ اِسی لئے مَیں بار بار صراطِ مستقیم سے دُور ہو گیا، کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھٹکتا

پھرا۔ لیکن پتا ہے، آخر میں اُنہوں نے خود اپنی راہ اور اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کیا۔"

"کون؟ کس نے خود کو ظاہر کیا؟"

میری سنی اَن سنی کرکے طارق بولا، "اُن ہی نے مجھے رات کے وقت اُس ریگستان سے نکالا۔ وہی میری راہنمائی کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔"

"تو بتاؤ تو سہی، آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"صرف ایک ہی یہ کچھ کرسکتا ہے۔ میرے مرشد۔"

"سچ؟! تو وہ کہاں ہے؟ وہ مَیں بھی ڈھونڈ رہا ہوں لیکن بے فائدہ۔"

طارق بولا، "اِسی مقصد سے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ مرشد کے پاس لانے کے لئے۔ آؤ میرے ساتھ۔" طارق نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں، یہ سب کچھ بکواس ہے۔ مَیں آپ کی اِس چال میں نہیں آؤں گا۔ آپ بھی میرے کان میں کچھ پھسپھسا کر مجھے اُبھاریں گے اور بعد میں چھوڑیں گے۔ چھوڑ دو مجھے۔ کیا پتا ہے کہ بادشاہ یا شاہزادہ

ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو اُن تک راستہ نہیں ہے۔ کیا آپ نے وہ پہاڑ نہیں دیکھا ہے؟ کیا معلوم کہ اُس پر ہے کیا۔"

"منظور، ایسی باتیں مت کرنا۔ مجھ پر بھروسا کرنا۔ اور اگر نہیں تو اُن پر جنہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اب آؤ۔ مرشد آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ کچھ قدم چل دیا پھر دوبارہ رک گیا۔ "اب تک وقت ہے۔"

"آپ تو پہاڑ کی طرف جا رہے ہیں!" مَیں نے جھنجھلا کر کہا۔ "مَیں نے وہ سارا راستہ آزما لیا ہے۔ وہ بکواس ہے۔ اُس طرف صرف آگ اور قہر ہے۔ ہاں، بادشاہ اگر ہو مجھ سے نفرت کرتا ہو گا۔ مجھے چھوڑ دو۔"

طارق ٹھنڈی آہ بھر کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ "منظور، لازم ہے کہ آپ میری بات پر یقین کریں۔ اگر آپ نے میرے آقا کو ایک بار دیکھا ہوتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ یقین کرو جب مَیں ریگستان میں تھا تو میرا دل بھی اِسی طرح نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ مَیں دنیا اور بادشاہ کو کوستا رہا۔ لیکن جب وہ آئے—مَیں کیا بتاؤں۔ اُن کو کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ میرے مرشد تو لاثانی ہیں۔ اُن جیسا کوئی نہیں ہے۔ اب آؤ۔"

نہ جانے کیوں، جب طارق نے مرشد کا ذکر کیا تو میرا دل اُچھل پڑا۔ گو میری مایوسی ختم نہ ہوئی پھر بھی دل میں اُمید کا چھوٹا سا بیج اُگنے لگا۔

"اب جلدی کرو! وہ انتظار کر رہے ہیں۔" طارق نے بے چینی سے کہا۔

مَیں اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل پڑا۔ خواب جیسا لگ رہا تھا۔ ہم تاریک اور ویران گلیوں میں سے سیدھے اُس مقام کی طرف بڑھتے گئے جو مَیں نے بڑی تلخی سے ترک کر دیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی میں ہر پیڑ کے پیچھے بھوت پریت چھپے لگ رہے تھے۔ ہم خاموشی سے قدم بہ قدم آگے بڑھے۔ اچانک میرے منہ سے چیخ نکلی۔ تین سائے کسی چٹان سے کھسک کر ہمارے راستے میں رک گئے۔

"کاؤں کاؤں، شکر ہے آپ آ گئے ہیں،" انور کوّے کی ٹرّاتی آواز سنائی دی۔ وہ اُڑ کر میرے کندھے پر بیٹھ گیا۔ وسیم نے سنجیدگی سے ہاتھ ملا کر کہا، "ہم بڑے فکرمند تھے۔ ہم اِتنے قریب پہنچ گئے تھے۔ اگر طارق نہ ہوتے تو نہ معلوم کیا ہو جاتا۔"

اور بیربل نے میرے ہاتھ میں ایک چمکتی چیز تھما دی۔

"میری تلوار!"

"تلوار کے بغیر آپ نہیں چل سکتے،" وہ مسکرا کر بولا۔

ہم دوبارہ آگے بڑھے۔ چڑھتے چڑھتے ہمارے سامنے گڑھے کی بھڑکتی آگ دور سے نظر آئی۔ میرے دوستوں کے منہ اُس کی روشنی میں لال رنگے ہوئے تھے۔ ہر ایک کا انداز سنجیدہ تھا، یوں جیسے کسی عظیم ہستی کے حضور آنے والے ہوں۔ لیکن اب میرے پاؤں دوبارہ بھاری ہونے لگے۔ مَیں ہر قدم مشکل ہی سے اُٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ میری ٹانگیں سیسے سے بنی لگ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ میرے اندر حول ناک وسوسے گونجنے لگے، "تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ تُو بادشاہ کے حضور نہیں آ سکتا؟ اپنی گندی اور بُری حالت کو دیکھ۔ تُو کس طرح اُس کے پاک حضور آ سکے گا؟ چھوڑ دے۔ واپس اپنے عزیزوں کے پاس جا اور آرام کر۔ سکون سے زندگی گزار۔ پورا مزہ لے لے کر مطمئن ہو جا۔" ساتھ ساتھ میری ہر بُری حرکت، ہر گندا خیال، ہر لالچ، ہر جھوٹ، ہر گھنونی بات، سب کچھ مجھ پر آ ٹھہرا، اور مَیں اُس

کے دباؤ کے نیچے کچلنے لگا۔ "ہاں،" مَیں نے بے کیفی سے سوچا، "مَیں کتنا خراب، کتنا ناپاک، کتنا نالائق ہوں۔"

"مَیں آگے نہیں جا سکتا،" مَیں مایوسی سے کراہ اُٹھا۔ میرے گھٹنے پگھلنے لگے۔

میرے ساتھیوں نے فکرمندی سے مجھ پر دھیان دیا۔ وسیم بولا، "ہم قریب ہی پہنچ گئے ہیں۔ اب ہمت مت ہارنا۔ اِس مرحلے پر سب کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اب تھوڑا سا صبر کر۔"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ہم ایک زوردار دہاڑ سے چونک پڑے۔ پیچھے مڑے تو چاندنی میں ایک ڈراؤنا سایہ دیکھا—ایک کالا ریچھ جو تیزی سے دوڑ کر ہم پر چڑھ آ رہا ہے۔ میرے پاؤں جم گئے، اور مَیں دہشت سے ٹھرٹھرانے لگا۔

طارق کچھ آگے چلا گیا تھا، مگر وہ فوراً پکار اُٹھا، "پہلے اپنا پشتی تھیلا اُتارو۔"

"مَیں نے اُسے پہلے سے پھینک دیا ہے،" مَیں چلّایا، تب دیکھا کہ وہ اب تک مضبوطی سے میری پشت سے بندھا ہوا ہے۔ ہاں، اِتنی

مضبوطی سے کہ مَیں اُسے کھولنے میں ناکام رہا۔ آخر میں انور نے اپنی چونچ سے مار مار کر اُسے کھول ڈالا، اور وسیم نے اُسے اُتارنے میں میری مدد کی۔ جوں ہی وہ اُتر گیا میرا دل بھی ہلکا ہو گیا۔ ہاں، دل کرتا تھا کہ پرندے کی طرح اُڑ کر ہَواؤں میں تیرے۔ اِتنی آزادی محسوس ہوئی کہ کچھ لمحوں تک خطرہ بھی ذہن سے نکل گیا۔

"اب اپنی تلوار کو پکڑ لو!" انور چلایا۔ عین وقت پر مَیں تلوار کو مضبوطی سے تھامنے میں کامیاب ہوا۔ تب بھالو ہمارے اوپر تھا۔ اگر مَیں کہتا کہ مَیں نے تلوار کو مہارت سے چلایا تو جھوٹ بولتا۔ حقیقت میں نہ مَیں اچھا کھلاڑی ہوں، نہ تلوار کو ٹھیک طرح سے چلانا جانتا ہوں۔ اگر سچ کہوں تو تلوار خود ہی چلنے لگی۔ کبھی وہ اِدھر کبھی اُدھر گھومتی۔ اُس کا پھل چاندنی میں چمکتی دمکتی، مارتی کاٹتی اور ریچھ کی کھال کو چھیدتی جاتی۔ کوّا بھی اُس پر جھپٹ کر چونچ سے مارتا، اور وسیم اپنی چھوٹی تلوار سے اُسے تنگ کرتا جاتا۔ بیچ میں بیربل ناچتے ہوئے اپنی تلوار چلاتا۔ درندے کے زخموں سے خون رسنے لگا تو وہ آخر میں چھلانگ لگا کر پیچھے ہٹ گیا اور بھاگتے بھاگتے اوجھل ہو گیا۔

"زبردست!" طارق خوشی سے چہچہایا۔ "اب آپ کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ اُمید ہے کہ مزید کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔"

اور سچ، اب میری ہمت کافی بڑھ گئی تھی۔ ہم ہانپتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہی نظارہ۔ گھوں گھوں، سی سی، لاوا کے فوارے، تارنا پُل۔ جب گڑھے کے پار جھانک ماری تو کچھ نہ دیکھا۔

بیربل بولا، "کیا کوئی دوسری طرف کھڑا نہیں ہے؟"

مَیں نے بھی محسوس کیا کہ وہاں دھندلے پن میں کوئی چیز ہے، کوئی عظیم ہستی۔ اور ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ یہ کوئی ڈراؤنا بھوت پریت ہو۔ مجھے دہشت محسوس نہ ہوئی بلکہ محبت اور پیار کی زوردار لہر، یوں جیسے مَیں پہلے ہی اُس سے واقف ہوں۔

طارق بولا، "اب پُل پر سے آگے نکلو۔"

مجھے جھٹکا لگا۔ "کیا آپ دیوانہ ہو گئے ہیں؟ اُس پر سے کوئی نہیں جا سکتا۔"

لیکن اب وسیم بول اُٹھا، "فکر مت کرو۔ آپ بے شک نہیں جا سکتے۔ لیکن جب ہمارے آقا دوسری طرف کھڑے ہوں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس پر نظر ڈالنا، تب ہی کوئی چنتا نہیں۔"

مَیں تارنا پُل کے پاس گیا اور دھیان سے اُس کا جائزہ لیا۔ وہ ویسے ہی دِکھتا تھا۔ پھر نظر اُٹھا کر گڑھے کے پار دیکھا۔

بیربل چہکا، "اب مَیں اُسے زیادہ صاف دیکھ سکتا ہوں۔"

پہلے مجھے کچھ نظر نہ آیا، پھر ہولے ہولے ایک سایہ سا اُبھر آیا۔ مَیں نے پورے زور سے نگاہ اُس سائے پر جمائی لیکن وہ زیادہ صفائی سے دکھائی نہ دیا۔ تاہم میری اُمید بڑھ گئی۔ مَیں نے پہلا قدم پُل پر رکھا۔

بیربل بولا، "یہ کیا ماجرا ہے؟"

پُل چٹ سے بدل گیا تھا۔ اب اُس کی شکل عجیب سی تھی۔ یہ شکل مَیں نے کہاں دیکھی تھی؟ سوچتے سوچتے اچانک مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ وہی کھمبا تھا جو مَیں نے سپنے میں دیکھا تھا۔ جس پر شہزادہ لٹکا ہوا تھا۔ مَیں ہکا بکا رہ گیا۔ لیکن اب بیٹھ کر اِس پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

انور میرے کندھے پر بیٹھ گیا، اور وسیم نے میرا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔ بیربل ٹھرٹھراتے ہوئے میرے پیچھے ہو لیا۔

مَیں جھجکتے جھجکتے قدم بہ قدم آگے بڑھا۔ عجیب بات ہے کہ جتنا ہی ہم آگے بڑھے میرے دماغ میں وسوسے گونجنے لگے۔ "تُو اِدھر کیا کر رہا ہے؟ یہ بس سپنا ہی ہے۔ اور ویسے تُو اُس طرف کیا کرے گا؟ واپس لوٹ جا۔ تیرے تمام رشتے دار بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ اُن کے بغیر تُو کیا کرے گا؟ کس طرح خوش رہے گا؟ یہ پُل دیکھ۔ اِس پر کون چل سکتا ہے؟ تیرے دماغ میں فطور ہے۔ اور نیچے دیکھ، یہ کیسا اُبلتا لاوا ہے۔ اب جلدی جلدی واپس جا ورنہ اُس میں گر جائے گا۔" میرے دل میں وسوسوں کا طوفان سا بن گیا۔

"رک جاؤ!" بیربل چیخا۔ "ہائے ہائے، مَیں گر جاؤں گا، ضرور گر جاؤں گا۔"

ہم دونوں ڈگمگانے لگے تو وسیم نے زور سے میرے ہاتھ کو دبایا، اور انور چلّایا، "آگے دیکھو، آگے دیکھو۔"

ہم نے آگے دیکھا تو کچھ سنبھل گئے۔ وہ سایہ اب تک گڑھے کے پار دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ زیادہ نہیں دِکھ رہا تھا، لیکن میرے اندر ایک پرسکون دبی سی آواز بول اُٹھی، "اُس طرف حقیقی زندگی ہے۔ جا اُس کے پاس۔" مَیں دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ اب تیزی سے چلتے چلتے ہم جلدی دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ ایک دم میری طاقت جاتی رہی، میرے گھٹنے پگھل گئے اور مَیں ہولے ہولے زمین پر گر گیا۔ نہ جانے کتنی دیر مَیں وہاں پڑا رہا۔

اِس کے برعکس بیربل بغلیں بجا رہا تھا۔ "کیا آپ نے دیکھا کہ مَیں نے پُل کو کیسے پار کیا؟ زبردست!"

تب وسیم میرے کندھے کو جھنجھوڑ کر بولا، "آؤ، آگے چلتے ہیں۔"

دوسرے کنارے پر طارق ہاتھ کے اشارے سے ہمیں الوداع کہہ کر اوجھل ہو گیا۔ "کیا طارق ہمارے ساتھ نہیں جائے گا؟" بیربل نے پوچھا۔

"طارق کو اَور بہت سے لوگوں کو بلانا ہے،" وسیم نے جواب دیا۔

مَیں نے اپنی آنکھوں کو اُٹھائیں تو دیکھا کہ وہ راز دار شکل آگے بڑھ کر ہاتھ سے آنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ ہم خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ راستہ بل کھاتے ہوئے چڑھنے لگا۔

اُس سفر کے بارے میں مجھے ہر بات صاف یاد نہیں۔ چڑھائی بہت تھی۔ اب چاندنی ڈراؤنی نہیں محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ اُس میں ہمارا راہنما صاف نظر آ رہا تھا۔ اب میرے دل میں سکون تھا، اور مَیں دل ہی دل میں خوشی سے للکار رہا تھا۔

کافی دیر کے بعد بیربل جوش سے پکارا، "وہ دیکھو، ہم باغ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

میرا دل اُچھل پڑا۔ ہماری خوشی کو دیکھ کر وسیم بولا، "یہ ہماری منزلِ مقصود نہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔" اور سچ کہوں تو جب ہم قریب قریب اُس سے گزرے بس سادہ سا میدان تھا جس پر دو چار پیڑ لگے تھے۔

ہم خاموشی سے آگے بڑھے۔

"بھئی، یہ کیا چکر ہے؟" بیربل نے پوچھا۔

مَیں نے نیچے دیکھا تو میری اور اُس کی تلواروں سے عجیب سی روشنی نکل رہی تھی۔ اُسے پکڑ لیا تو دیکھا کہ اُس پر لکھائی زور سے چمک رہی تھی:
"راہ اور حق اور زندگی مَیں ہوں۔"
انور بولا، "جس نے اِن کو بنایا وہ قریب ہے، اِس لئے یہ چمکنے لگی ہیں۔"
میری حیرانی بڑھتی گئی، کیونکہ ہم سیدھے چوٹی کی طرف چڑھ رہے تھے۔ اور سچ مچ، پَو پھٹتے ہی ہم چوٹی پر پہنچ گئے۔ کوئی محل نظر نہ آیا بلکہ ایک ہرا بھرا سبزہ زار جس کے درمیان ایک چشمہ اُبل رہا تھا۔ اُس سے صاف شفاف پانی زور سے پھوٹ کر شاداب گھاس میں سے بہہ رہا تھا۔ نالی کے کنارے کنارے پر رنگا رنگ پھول لہلہا رہے تھے۔ اب سورج کا لال چہرہ اُفق پر نظر آنے لگا۔ اُس کی کرنوں نے ٹٹول ٹٹول کر چوٹی کی ہر چیز اپنی گلابی اُنگلیوں سے چھو دیا۔ گھاس کے ہر تنکے پر لگے شب نم کے ہزاروں قطرے ایک دم چمک اُٹھے۔
اب وہ ہستی چشمے کے پاس رک کر مڑی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ محل کا میزبان تھا، بادشاہ کا شہزادہ۔ ہم دونوں خوشی سے آگے لپک کر اُن

کے سامنے جھک گئے۔ ہم نے کچھ نہ کہا۔ ایک نرم ہاتھ میرے سر پر پھرا، اور میرے اندر گہری محبت کی لہر اُبھر آئی۔ ساتھ ہی راحت اور اطمینان، یوں جیسا مَیں نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ اب میری اَور کوئی خواہش نہ رہی۔ بس مَیں ہمیشہ کے لئے یہاں شہزادے کے قدموں میں رہوں۔

نہ جانے ہم کتنی دیر وہاں جھکے رہے۔ میرے اردگرد دنیا رک گئی۔ پھر میرے آقا نے نرمی سے ہم سے کہا، "اب چشمے میں نہا لو۔ سب کچھ تیار ہے۔" ہم اُٹھ کر چشمے کے کنارے پہنچے۔ وہاں سفید صاف ستھرے کپڑے تیار رکھے ہوئے تھے۔ جھٹ سے پسینے اور کیچڑ سے لت پت کپڑے اُتار کر مَیں نے ٹھنڈے اُبلتے پانی میں غوطہ لگایا۔ "چھپ!" بیربل چھلانگ لگا کر میرے پیچھے پانی میں کود پڑا۔ کتنا مزہ آیا۔ جان میں جان آئی۔ ہم چھوٹے بچوں کی طرح ہنستے چہکتے ایک دوسرے کو چھینٹے مارنے لگے۔ پھر نکل کر نئے کپڑے پہن لئے۔ ایک چھوٹی سی میز پر جام اور روٹی تیار رکھی گئی تھی۔ گرما گرم روٹی کو کھا کر سفر کی تھکاوٹ دُور

ہوئی، اور جام کی چمکتی شربت کو پی کر جسم کی رگ رگ میں نئی طاقت بہنے لگی۔

تب ہم خوشی سے اُچھلتے کودتے شہزادے کے ساتھ سبزہ زار میں ٹہلنے لگے۔ ہمارے آقا زیادہ کچھ نہ بولے۔ اور ہمارے لئے بھی اُن کے ساتھ چلنا کافی تھا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا جس سے مَیں دنگ رہ گیا، "میرے آقا میری موجودگی سے لطف اُٹھا رہے ہیں۔ مجھ جیسے نالائق آدمی سے۔" ہم گھومتے پھرتے گھنٹوں چوٹی پر رہے۔

اچانک بیربل رک گیا۔ ظاہر تھا کہ کوئی بات اُسے کھٹک رہی تھی۔ آخر میں اُس نے تیوری چڑھا کر کہا، "یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ نہ ضیافت ہے، نہ دیگر مہمان۔"

"میرا محل کہیں اَور ہے۔ وہاں تم اِس وقت نہیں جا سکتے۔ لیکن وہ وقت بھی آئے گا۔ نیچے دیکھو۔" ہم نے ہاتھ سے ماتھے پر سایہ کر کے چوٹی کے دامن میں رسوم آباد کو دیکھا۔ وہاں گلیاں لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھیں۔ ہر ایک اپنے کام میں مصروف تھا۔ مندروں، گرجوں اور مسجدوں میں لوگوں کی ٹولیاں جا رہی اور اُن سے نکل رہی تھیں۔ چوکوں میں لوگ

بتوں کی پوجا کر رہے تھے۔ دوسرے سودا بازی میں لگے تھے۔ شہر کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ ہر طرف شور شرابہ اور ہل چل۔

"مجھے اِن پر ترس آتا ہے،" میرے آقا نے نرمی سے کہا۔ "اِن اندھوں کو بھی میرے حضور آنے کا موقع دینا چاہیئے۔ اب تک اِن میں کچھ ہیں جو آئیں گے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے، "طارق نے تمہارے پاس آ کر تمہیں بلایا۔ مَیں اُس سے اِتنا خوش ہوں۔ پہلے وہ ہر راستہ اختیار کرنے سے کتراتا تھا۔ اور اب وہ بڑی دلیری سے لوگوں کے پاس جا کر اُنہیں میری راہ کے بارے میں بتاتا ہے۔ اُسے بہت مار پیٹ کھانی پڑی ہے، لیکن وہ مطمئن رہتا ہے۔ سوچ لو۔ جن طالب علموں کو تم نے آزاد کر دیا، وہ اب تک بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ طارق ہر ایک کے پاس جا کر اُسے بُلا رہا ہے۔"

شہریوں کی حرکتیں تکتے تکتے مجھ پر اُداسی طاری ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ دیکھ کر شہزادے نے اپنا ہاتھ میرے سر پر پھیر دیا۔ وہ بولے، "مَیں تیرے دکھ کو جانتا ہوں۔"

تب مجھے وہ خواب یاد آیا جس میں اُنہیں موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا تھا۔ ”ہاں، سچ مچ، وہ دکھ درد جانتے ہیں،“ مجھے خیال آیا۔ ”اُن جیسا ہم درد کوئی نہیں ہے۔“

”مَیں تم کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا،“ وہ بولے۔ ”اب سے کوئی بھی یہ صاف ستھرے شاہی کپڑے تم سے چھین نہیں سکے گا۔ اب سے مَیں تمہارے دلوں میں سکونت کروں گا۔ بے شک تم سے غلطیاں ہوتی رہیں گی۔ لیکن اندر ہی اندر میری روح تمہیں بیدار رکھے گی، تمہیں میری راہ پر واپس لاتی رہے گی۔ تلوار تمہاری مدد کرے گی، اور وسیم اور انور بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔“

کچھ دیر کے لئے مَیں اپنے جذبات سے لڑتا رہا، پھر آخر کار پختہ آواز میں بولا، ”ٹھیک ہے، مَیں تیار ہوں۔ مجھے بھیج دیں۔“ بیربل نے میرے ہاں میں ہاں ملایا۔

یہ سن کر وہ مسکرائے، اور یہ مسکراہٹ یوں میرے اندر پڑ گئی جیسے سورج کی پہلی کرن بے جان شیشے کو روشن کر دیتی ہے۔ میرا پورا وجود اُس مسکراہٹ کے نور میں چمکنے دمکنے لگا۔

ایک آخری نظر اُس خوب صورت جگہ پر دوڑا کر ہم روانہ ہوئے۔ اُترتے وقت مَیں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شہزادہ اب تک نظر آئے۔ پوری چوٹی ایک خاص نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ہم اُترتے اُترتے گڑھے کے پاس پہنچ گئے۔ اِس طرف سے پار کرنا آسان تھا، اور ہم خاموشی سے آگے بڑھ کر شہر میں داخل ہوئے۔

ہنگامہ

اُترتے اُترتے ہم دوبارہ رسوم آباد کی تنگ گلیوں میں گھس آئے۔

"ارے، یہ دیکھو۔" ایک دکان میں ہزاروں بُت چمک دمک رہے تھے۔ کچھ انسان جیسے بڑے تھے، کچھ اِتنے چھوٹے کہ جیب میں بھی ڈالا جائے۔ کچھ لکڑی کے بنے ہوئے تھے، کچھ چاندی، سونے یا سنگِ مرمر کے۔ سب ماہر فن کاروں سے بنائے گئے تھے۔

"اِن بُتوں کو دیکھو!" بیربل نے حیرت سے کہا۔ "یہ تو کھمبے پر لگے ہوئے ہیں۔"

"آپ اِن کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟" مَیں نے دکان دار سے پوچھا جو سڑک کے کنارے کسی گاہک سے گپیں ہانک رہا تھا۔

"جنابِ عالی، یہ بُت برائے فروخت ہیں۔ یقین کرو، یہ اے ون کوالٹی کے ہیں۔ ہمارے شہر کے ماہرین سے بنائے گئے ہیں۔"

"مَیں یہ کیوں خریدوں؟" مَیں نے سوال کیا۔

"دیکھو نا۔ اگر اِن کو گھر میں رکھو تو بڑی برکت ملے گی۔ بے اولاد کو بچہ ملے گا۔ ہر کاروبار کامیاب رہے گا۔ جناب، یہ عام بُت نہیں ہیں۔ اِن پر مقدّس پانی چھڑکا گیا ہے۔"

"کیا یہ شہزادے کی شکل و صورت نہیں؟"

"جی، ضرور۔ ہم کسی اَور کے بُت نہیں بناتے۔ اِن سے زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے۔"

بیربل سوداگر کا بازو پکڑ کر بولا۔ "کیا آپ نے کبھی شہزادے کو دیکھا ہے؟"

سوداگر نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوایا۔ "دیکھو نا۔ مَیں تاجر ہوں، فال نکالنے والا نہیں۔ یقین کرو، اگر اِن میں سے کوئی خریدا تو یہ بہت ہے۔

اُس کی ساری قوتیں تم کو حاصل ہوں گی۔ اور یہ سب کچھ فقط پانچ سَو سکوں میں۔"

"لیکن یہ تو نقلی ہیں۔ کیا آپ اصلی چیز نہیں دیکھنا چاہتے؟ خود شہزادے سے ملو۔ یہ کچھ بے کار ہے۔ دوست، ہم نے اُنہیں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سنو، وہ تو آپ کو بلا رہے ہیں۔"

اب سوداگر پھر گیا۔ لوگ جمع ہو کر میری بات غور سے سن رہے تھے۔ اُسے اندازہ ہوا کہ کاروبار بگڑ گیا ہے۔ وہ گرجا، "آؤ لوگو، اِن مخبوطوں کو دیکھو۔ یہ ہمارے پاک تزئین رسم و رواج کے خلاف افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ یہ ہمارے مقدّس ولیوں کی توہین کر رہے ہیں۔" سوداگر ہمیں جھڑکتا گیا تو چاروں طرف سے لوگ تماشا دیکھنے دوڑے آئے۔ دھمکیاں بلند ہوئیں۔ کچھ ہمیں دھکے دینے لگے۔

"مارو اِن کو،" کوئی چیخا۔

"قاضی کو پیش کرنا،" کوئی اَور چلّایا۔

یوں ہمیں دھکے دیتے اور گھسیٹتے ہوئے عدالت میں پہنچایا گیا۔ لوگوں کی تعداد کے باعث ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ قاضی جب ہنگامہ دیکھا تو پُروقار انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ شور و غل کو بند کرنے میں بہت دیر لگی۔

"خاموش!" جج آخر کار گرجا اور ہتھوڑی میز پر ٹھوکی۔ لوگ چپ ہو گئے۔ "اِن کا کیا جرم ہے؟" اُس نے پوچھا۔

ایک پہرے دار کالا زرہ بکتر پہنے کھڑا ہوا اور شائستگی سے بولا، "حضور، اِنہوں نے ہمارے مذہب کی توہین کی ہے۔ ہاں، یہ دوسروں کو اپنے خراب خیالوں سے ورغلاتے ہیں۔"

"کیا کوئی اَور گواہی ہے؟" قاضی نے دریافت کیا۔

بُت بیچنے والا کھڑا ہوا۔ "اِنہوں نے ہمارے رسم و رواج کے خلاف باتیں کی ہیں۔ اِس سے بڑھ کر اِنہوں نے ہمارے مقدّس ولیوں کی توہین بھی کی ہے۔"

تماشائیوں میں وسوسے بلند ہوئے۔ تب ہال کا بڑا دروازہ دھڑام سے کھل گیا، اور آئین محل کا بزرگ اِٹھلاتے ہوئے اندر آیا۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹا اور نہایت دہشت زدہ طالب علم تھا۔ وہ اُسے

گھسیٹتے ہوئے سامنے لایا۔ پھر احترام سے جج کے سامنے کھڑے ہو کر بول اُٹھا، "گستاخی معاف، حضور۔ مَیں ایک سنگین جرم کا گواہ لایا ہوں۔ گزارش ہے کہ اُسے پیش کروں۔"

تماشائیوں میں شہد کی مکھیوں کی سی تیز بھنبھناہٹ بلند ہوئی۔

"خاموش!" جج گرجا، پھر بولا، "پیش کریں اُسے۔"

بزرگ نے بچے کو جھڑکا دے کر کرخت آواز میں کہا، "جنابِ عالی، یہ آدمی بے حد بے دین ہیں۔ اِنہوں نے مجھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بہانے میرے گھر میں آ کر طالب علموں کو ورغلا دیا۔ اگر یقین نہیں تو میرے گھر آ کر اُس کا بُرا حال دیکھ لیجئے۔ میرے سَو کے اوپر طالب علموں میں اِتنی گڑبڑ مچ گئی کہ تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔"

"اچھا،" جج بولا۔ "اِس نے کیا کیا کہ اِتنی گڑبڑ مچ گئی؟"

"حضور، اِنہوں نے ہمارے قوانین کی توہین کی ہے! کیا اِس سے سنگین جرم ہو سکتا ہے؟ ہمارے شہر کے عزیز اور ابدی قانون کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اگر اِسے چھوڑیں گے تو آخر شہر کے حالات کیسے رہیں گے؟ بیٹا، کچھ بتاؤ۔" اُس نے لڑکے کو جھڑکا دے دیا۔ اُن کے قریب ہونے

کے باعث مَیں نے دیکھا کہ وہ زنجیر سے بندھا ہوا ہے، یوں کہ نظر نہ آئے۔ بزرگ نے زنجیر کو پیٹھ کے پیچھے زور سے کھینچا رکھا تھا۔

لڑکا درد سے تڑپتے ہوئے گھگھیایا، "مَیں ... مَیں گواہ ہوں۔" اُس کا پیلا سا چہرہ گھبراہٹ سے کانپ رہا تھا۔

"اَور بتاؤ،" بزرگ زنجیر کو زور سے جھٹکا دے کر بولا۔

"آہ ... اِنہوں نے قوانین کے خلاف باتیں کی ہیں ... ہاں، پہلے ہم سکون سے پڑھ رہے تھے تو اِنہوں نے گڑبڑ مچا دی۔"

"کیا کہا مَیں نے،" بزرگ فتح مندی سے بولا۔ "سَو کے اوپر طالب علم اِس کے گواہ ہیں کہ یہ مخبوط شہر میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ اور اگر شہر کا قانون تہس نہس ہو جائے تو پھر کیا رہے گا؟"

"کیا آپ اُن کا الزام مانتے ہیں؟" جج نے ہم سے پوچھا۔

بیربل بولا، "میرے چچا رامن نے ایک بار کہا، 'بیربل بیٹے، عدالت میں کسی گواہ پر یقین نہ کرو۔ سب جھوٹ ہیں۔'" وہ طالب علم کے پاس گیا اور جھٹکے سے زنجیر کو بزرگ کے ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر اُس نے

پوچھا، ”اب دوبارہ سوچ لو، چھوٹے۔ تم نے کیا دیکھا؟ کیا ہم نے سچ مچ قوانین کے خلاف باتیں کیں۔“

”نہیں، سر۔“ بچا ڈرے ہوئے بولا۔

بزرگ نے جھٹکے سے زنجیر کو بیربل کے ہاتھ سے چھڑایا۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”ہاں ہاں، قوانین کے خلاف باتیں کیں،“ طالب علم درد سے تڑپ اُٹھا۔

بیربل جج سے مخاطب ہوا۔ ”جنابِ عالی، کیا ایسے گواہ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟“

جج بولا، ”اچھا۔ تو تمہارا ساتھی کیا کہتا ہے؟“

”مَیں نے تو اصلی شہزادے کو دیکھا ہے،“ مَیں نے جواب دیا۔ ”اِس شہر میں صرف اُن کے نقلی بُت ملتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں اُن سے ملنا چاہتے ہیں؟ اور جہاں قانون کی بات ہے، کیا آپ شاہی قانون نہیں جاننا چاہتے؟“

"ٹھاہ!" جج نے آپے سے باہر ہو کر میرے گال پر تھپڑ مارا۔ بھیڑ کا شور شرابہ بڑھتا گیا۔ پھر اپنے آپ پر قابو رکھ کر جج بولا، "حرام زادے، تیرے الفاظ سرکشی اور توہین کا صاف ثبوت ہیں۔ جیوری کا کیا فیصلہ ہے؟"

اہلِ جیوری عدالت میں ایک طرف بیٹھے آپس میں پھسپھسانے لگے۔ پھر اُن کا صدر کھڑا ہوا۔ "ملزم ہمارے پاک آئین اور ہمارے عزیز دین کے خلاف ہیں۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے دوسروں کو غلط کام کرنے پر اُکسایا ہے۔ ہمارا فیصلہ ہے سزائے موت۔"

دالان تالیوں کے بجنے اور حقارت آمیز نعروں سے گونج اُٹھا۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میرا منہ خشک ہو گیا۔

"خاموش،" قاضی نے زور سے ہتھوڑی میز پر ٹھوکی۔ پھر اُس نے ہم سے بات کی، "تم نے جیوری کا فیصلہ سن لیا ہے۔ اب غور سے سوچو۔ اب تک مَیں تمہیں بچنے کا موقع دینے کو تیار ہوں۔ اب تک تُم آزاد ہو سکتے ہو۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا تاکہ اُس کی بات پورے طور پر ہماری سمجھ میں آئے۔ پھر اپنی بات جاری رکھی، "اگر تم

اپنے غلط خیالوں کو تسلیم کرو اور وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی باتیں کبھی نہیں کروں گا تو آزاد ہو جاؤ گے۔ ورنہ ...“ وہ چپ ہو گیا۔

مَیں بے چینی سے تڑپنے لگا اور سوچا، ”کیا یہ بات اِتنی اہمیت رکھتی ہے؟ کیوں نہ اِن باتوں کا انکار کروں تاکہ بچ کر اپنا سفر جاری رکھوں؟ کیا فائدہ اگر مَیں مر جاؤں؟“

ایسے شک و شبہے میں پڑ کر مَیں جھجکتا رہا۔ لیکن اچانک میری نظر دو جاننے والوں پر پڑی جو ہجوم کے بیچ میں بیٹھے تھے۔ وسیم بونا اور اُس کے کندھے پر بیٹھا کوّا انور سنجیدہ اور دلاسا دینے والی نگاہوں سے مجھے تک رہے تھے۔ مَیں قاضی کی طرف مڑا۔ ”سرکار۔“ میری آواز کچھ کانپ رہی تھی۔ ”مَیں اپنے آقا کو کس طرح رد کر سکتا ہوں؟“

بیربل کی بلند آواز نے میرا ساتھ دیا، ”میرے چچا رامن کہتے تھے، ’بیربل بیٹے، کبھی بھی نمک حرام نہ بن۔ جس کی روٹی کھاتے ہو اُس کا انکار کبھی مت کرنا‘۔“

عدالت میں سے بڑبڑانے کی لہر دوڑی۔ قاضی گرجا، ”پھر جیوری کا فیصلہ تم پر عائد ہے۔“

اب تماشائیوں کا شور و غل کسی کے قابو میں نہ آ سکا۔ دو سپاہی ہمیں گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ چاروں طرف سے لوگ منہ پر تھوکتے اور گھونسے مارتے۔ اِسی طرح لڑکھڑاتے ڈگمگاتے ہمیں شہر سے باہر ایک اونچی چٹان پر دھکیل دیا گیا۔ اوپر پہنچ کر میری نظر نے آخری بار ارد گرد کا منظر جذب کر لیا۔ دُور دُور افق پر دشمن کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ کچھ نزدیک سرائے شکوک کا پہاڑ، ریگستان کے ٹیلے اور شہر عیاش خونی آفتاب کی سرخ کرنوں میں چمک رہے تھے۔ پھر کوہِ دانش، اژدہے اور چڑیل کا غار، دیو کا پُل اور نادان کسان کا شہر۔ تب میری نگاہ رسوم آباد پر پڑی جو سائے میں ڈوب چکا تھا۔ گدھ اُس کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ لیکن بیچ میں پہاڑ کی چوٹی سورج کی آخری کرنوں میں جگمگا رہی تھی۔ نیچے جھانکا تو چکر آنے لگے۔ چٹان کے دامن کے پیڑ کھلونے جیسے لگ رہے تھے۔ مَیں نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ اچانک نہ جانے کیوں مجھے وہ خواب یاد آیا جس میں شہزادے کی خون سے لت پت لاش کھمبے پر لٹکی دیکھی تھی۔ ”میرے آقا مجھ سے خوش ہوں گے،“ مَیں نے سوچا، اور میرا دل عجیب سی خوشی سے بھر گیا۔

بیربل میرے ساتھ کھڑا ہوا۔ ”حوصلہ رکھو،“ وہ بولا۔ ”میرے چچا رامن کہا کرتے تھے، ’بیربل بیٹا، زندگی گنّے کا ڈنڈا ہے۔ ایک سرے سے شروع کرکے مزے سے چوستے جاؤ۔ مگر ایک دن تم ضرور دوسرے سرے تک پہنچو گے۔ تب تعجب مت کرنا‘۔“

نہ معلوم کیوں، لیکن اُس کی بات سن کر اور اُس کی عجیب سی شکل وہاں کھڑی دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ بھی ٹھہاکے مارنے لگا۔

”کیا بات ہے،“ مَیں نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے ساتھ سفر کرکے کتنا مزہ آیا۔ کتنا اچھا وقت گزارا۔ پھر ملیں گے۔“ ہم نے ہاتھ ملائے۔

پھر کسی نے مجھے دھکا دیا۔ میرے حواس اُڑنے لگے۔ ہَوا کی ”شوں شوں“ کی آواز اور گرنے کا احساس۔ نیچے دھندلی سی زمین جو جھپٹ کر قریب آ رہی ہے۔ پھر دنیا میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

الوداع

"کاؤں کاؤں۔"

مَیں ادھ موئی حالت میں کہیں لیٹا تھا۔ "یہ کیا آواز ہے؟ مَیں کہاں ہوں؟" مَیں نے سوچا، پھر اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن شدید درد کی لہر میرے جسم میں سے دوڑی اور مَیں آہ بھر کر دوبارہ لیٹ گیا۔

"غرغرغر۔" قریب کوئی ندی کھَولتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ مَیں نرم خوشبو دار گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ کسی کی آہٹ قریب آئی۔ ایک ٹھنڈا اور نرم سا ہاتھ میری پیشانی پر پھر گیا۔ مجھے بڑا سکون اور اطمینان ہوا۔ مَیں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ دھندلکے میں کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"آپ ...؟" کچھ اَور پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مَیں نے اُنہیں پہچان لیا تھا۔ صلیب پر لٹکی شکل، ضیافت کے شہزادہ، میرے آقا۔

" کچھ پی لے۔" مَیں نے ایک چمکتے ہوئے جام سے چسکی لی۔ اُن کی آواز بے بیان نرم اور رحم دل تھی۔ بے شک رعب اور جلال کا عنصر بھی تھا، ہاں اختیار اور قوت، لیکن ساتھ ساتھ اُس میں کتنا پیار اور مٹھاس، کتنی نرمی اور سچائی تھی۔

"مت ڈر،" وہ بولے۔ "تُو جیتا رہے گا۔" جام سے پی کر میرے اندر زندگی کا دروازہ کھل گیا، اور مَیں ایک نئی پُر اُمید دنیا میں داخل ہوا جس میں ہر چیز تر و تازہ دکھائی دے رہی تھی، ہر شے انسان کی ناقص اور لالچی گرفت سے آزاد تھی—نیلا نیلا آسمان، شاداب میدان، چمکتا دمکتا دریا، پُرسکون جنگل اور امن پسند درندے جو ایک دوسرے کو نہیں پھاڑتے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے ایسے شہر گزرے جن کے باشندے گناہ کئے بغیر امن و امان سے زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اُس پوری دنیا پر ایک خاص جھلک چھائی ہوئی تھی، شہزادے کی مسکان کی جھلک۔

"دوسرے کہاں ہیں؟" مَیں نے رک رک کر کمزور آواز میں پوچھا۔

"ہم بھی حاضر ہیں۔" انور امید اور وسیم وفا میرے سرہانے آئے اور تسلی دیتے ہوئے مسکرائے۔ مَیں نے ارد گرد جھانک ماری۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جنگل کی کھلی جگہ میں ہیں۔

"بیربل نہیں ہے۔"

"وہ آگے نکلا ہے۔ کچھ اَور پی لے۔"

پینے سے خشک گلے کو خوش گوار ٹھنڈک ملی۔ مَیں اونگھتے اونگھتے غنودگی کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔

"بیٹا۔"

"مَیں کہاں ہوں؟" مَیں نے اُونگھتی حالت میں سوچا۔ "اچھا ... میرے آقا مجھے بُلا رہے ہیں۔" مَیں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھول کر پوچھا، "کیا اب مَیں آپ کے محل میں داخل ہونے والا ہوں؟"

دھندلکے میں شہزادے کا چہرہ مسکرایا، مگر افسوس کی جھلک صاف نمودار ہوئی۔ "نہیں بیٹا۔ تیرا وقت اب تک نہیں آیا۔"

”تو سب کچھ فضول تھا ؟“ مَیں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بادشاہ کے منصوبے میں کوئی بات بےمقصد نہیں ہوتی،“ اُنہوں نے پیار سے جواب دیا۔ ”پہلے تجھے اپنی پرانی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور مَیں خاموشی سے رو پڑا۔

”بیٹا، مَیں تیرا ساتھ دوں گا۔ میری روح تیری راہنمائی کرتی رہے گی،“ شہزادے نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ ”تیرے دوست بھی تیرے ساتھ رہیں گے، اور تیری تلوار کام آئے گی۔ حوصلہ رکھ۔ اِس کے علاوہ مَیں تجھے ایک اَور قیمتی چیز دے دیتا ہوں۔“ اُنہوں نے میرے ہاتھ میں چمکتا جام اور ایک گرما گرم روٹی تھما دی۔ ”تجھے اِس کی اشد ضرورت ہو گی۔ جب ناگوار دن آئیں گے تو جام میں سے پی کر تیری پیاس بجھ جائے گی۔ روٹی سے کھا کر تیری بھوک جاتی رہے گی۔ تجھے نئے سرے سے طاقت ملے گی۔“

مَیں نے سر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میرا بےحس سر نہایت بھاری لگ رہا تھا۔ ایک سفید سی شکل نے میرے ماتھے پر

ہاتھ پھیر دیا۔ مَیں ٹھنڈی سانس لے کر بے ہوشی کے عالَم میں ڈوبنے لگا۔

"یاد رکھ۔ اب سے تُو بادشاہ کا شہری ہے۔ سلامتی کے ساتھ جا۔" یہ کہہ کر شہزادہ اوجھل ہو گئے۔ لیکن اُن کے شفقت بھرے چہرے کی یاد کبھی نہیں مٹنے کی۔ وہ ہمیشہ تک میرے دل میں قائم رہے گی۔

پرانی دنیا

"منظور، منظور!" کسی کا بے رحم ہاتھ مجھے زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ بہن کا منہ فکرمندی سے میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مَیں نے اپنی پتلون کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ کپڑے گیلے ہیں۔ مَیں کنوئیں کے پاس ہی برگد کے پیڑ کے سائے میں چارپائی پر لیٹا تھا۔

مجھے حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر بہن کچھ مطمئن ہوئی۔ "آپ کیسے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ اب تک اُس کی آواز پریشانی سے کانپ رہی تھی۔

"گزارہ ہے،" مَیں بڑبڑایا۔ مَیں نے مشکل سے مسکرا کر اُٹھنے بیٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ٹانگ اچھی طرح حرکت نہیں کر رہی تھی۔ تب یاد

آیا کہ اِس دنیا میں مَیں معذور ہوں۔ ٹھنڈی سانس لے کر مَیں دوبارہ لیٹ گیا۔

"لیٹے رہو۔ شکر ہے کہ شاہ باز اور اُس کا بھائی یہاں سے گزر رہے تھے جب آپ کنوئیں میں گر گئے۔

"سچ؟" مَیں نے آہستہ کہا، پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا۔

"آپ یقین نہیں کریں گے کہ مَیں نے کنویں میں کیسا وقت گزارا۔"

"آپ تھکے ہوئے ہیں۔" بہن نے ماتھے پر ہاتھ پھیر دیا۔ "شاہ باز اور اُس کے بھائی نے آپ کو فوراً نکال دیا۔ اب آرام کریں۔"

"اچھا،" مَیں نے کہا اور آنکھوں کو بند کیا۔